رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۲۰

ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ

جلد ۳۸ ، عدد ۶

ماھنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاھور پاکستان

قیمت سالانہ چھ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۳۸	ذی الحجہ سنہ ۱۳۷۱ھ مطابق ستمبر سنہ ۱۹۵۲ء	عدد ۶

سید ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اشارات

پچھلے مہینے اِن صفحات میں جو دستوری تجاویز پیش کی گئی تھیں اُن میں ہمارے پیشِ نظر صرف یہ امر تھا کہ دستور ساز اسمبلی کے ارکان کو اُن خاص دستوری نکات کے بارے میں صحیح مشورہ دیا جائے جن کے متعلق سابق دستوری سفارشات اور اربابِ حکومت کے عام رجحان کو دیکھتے ہوئے ہمیں اندیشہ تھا کہ ہمارے ملک کے دستور ساز حضرات غلط نقطۂ نظر اختیار کرنے والے ہیں۔ اسی غرض کے لیے ہم نے کوشش کی کہ ایک مختصر تحریر میں اپنی تمام تجاویز بیک وقت پیش کر دیں۔ ہر تجویز کے ساتھ اس کے دلائل اور امکانی شبہات کے جوابات درج کیے جاتے تو سلسلۂ کلام دراز ہو جاتا اور وہ فائدہ حاصل نہ ہوتا جو ایک مختصر تحریر سے حاصل ہوا کرتا ہے۔ لیکن اِن تجاویز کی اشاعت کے بعد مختلف حلقوں سے ہمارے پاس جو سوالات، شبہات اور اعتراضات آئے ہیں، ان کو دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ ہماری تجاویز میں سے کم از کم بعض تجاویز ایسی ضرور ہیں جن کی مزید تشریح درکار ہے۔

پہلا اعتراض ایک نامور بیرسٹر صاحب کی طرف سے ہماری اس تجویز پر آیا ہے کہ دستور کی ایک مستقل دفعہ کی رو سے قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون پاس کرنا مجالسِ قانون ساز کے دائرۂ اختیار سے خارج کر دیا جائے، اور ہر شہری کو یہ حق دیا جائے کہ وہ سپریم کورٹ میں کسی قانون کو اِس بنیاد پر چیلنج کر سکے۔ اس پر ان کا اعتراض یہ ہے کہ آپ اس طرح قوانین کے موافقِ کتاب و سنت ہونے کا آخری فیصلہ سپریم کورٹ کے ججوں پر چھوڑنا چاہتے ہیں، حالانکہ ابھی ایک مدت دراز تک یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ ہمارے جج اِس معاملے میں صحیح فیصلہ دے سکیں گے۔

بلاشبہ یہ ایک وزنی اعتراض ہے، اور ہم اس سے اور اس کے وزن سے پہلے بھی غافل نہ تھے لیکن

ہمارے سامنے اس وقت جو پیچیدگی درپیش ہے اُس کو اگر کوئی شخص اچھی طرح سمجھ لے تو وہ تسلیم کرے گا کہ بحالت موجودہ اس کا کوئی دوسرا حل اتنا اطمینان بخش بھی نہیں ہے جتنا ہمارا تجویز کردہ حل ہے۔

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ "ایک اسلامی ریاست میں کسی لیجسلیچر کو قرآن وسنت کے خلاف قانون بنانے کا مجاز نہ ہونا چاہیے"، یہ بالکل ایک متفق علیہ مسئلہ ہے جس سے کوئی مسلمان مسلمان ہوتے ہوئے اختلاف نہیں کر سکتا، بلکہ اس سے اختلاف کرکے کوئی شخص مسلمان بھی نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا اس کو تو بہرحال ہمارے دستور میں ثبت ہونا چاہیے، اور اس کی حیثیت محض ایک "رہنما اصول" کی نہیں بلکہ ایک قطعی دستوری حکم کی ہونی چاہیے تاکہ اُس پر قانونی نتائج مترتب ہو سکیں۔ لیکن آگے بڑھ کر جس مقام سے پیچیدگی کا آغاز ہوتا ہے وہ یہ سوال ہے کہ کسی قانون کے موافق کتاب وسنت یا مخالفِ کتاب وسنت ہونے کا فیصلہ کون کرے گا؟ عملاً اس کے تین ہی جواب ممکن ہیں:-

ایک یہ کہ اس کا آخری فیصلہ خود مجلس قانون ساز پر چھوڑا جائے۔

دوسرے یہ کہ علماء کی ایک مجلس اس کا فیصلہ کرے۔

تیسرے یہ کہ اس معاملے میں سپریم کورٹ پر اعتماد کیا جائے۔

ان میں سے پہلی صورت اس لیے ناقابلِ قبول ہے کہ جب تک رائے عام کی کافی تربیت نہ ہو جائے اور جب تک اس ملک میں انتخابات دھن اور دھونس اور دھوکے اور دھاندلیوں کے اثرات سے محفوظ نہ ہوں، اور جب تک مجالس قانون ساز پارٹی سسٹم کی گندگیوں سے پاک نہ ہو جائیں، یہ امید ہرگز نہیں کی جاسکتی کہ ہماری ان مجالس کی اکثریت ایسے ایماندار اور خداترس نمائندوں پر مشتمل ہوگی جو دستور کی اس دفعہ کا وہ احترام ملحوظ رکھیں گے جو ایک سچے مسلمان کو رکھنا چاہیے۔ اس لیے ابھی وہ وقت بہت دُور ہے جب اس ملک کی نمائندہ مجلسیں اس اعتماد کی مستحق ہو سکیں کہ ہم اپنے دین وایمان کا ایسا اہم معاملہ اطمینان کے ساتھ ان کے حوالے کر دیں۔ اس حقیقت کو خود دستور ساز اسمبلی کے ارکان جتنا جانتے ہیں شاید کوئی دوسرا نہیں جانتا۔ آپ جب چاہیں ان میں سے ایک ایک شخص کے ہاتھ پر قرآن رکھ کر پوچھ لیں۔ اگر آپ یہ

اطمینان دلا دیں گے کہ اس کی رائے شائع نہ کی جائے گی تو انشاء اللہ ان میں سے ہر شخص یہ شہادت دیگا کہ اس معاملے میں خود اس کی اپنی اسمبلی اعتماد کی مستحق نہیں ہے۔

دوسری صورت میں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان علماء کو منتخب کون کرے گا؟ کیا عوام جن کے ووٹ کا حشر ہم ابھی پنجاب، سرحد اور بہاولپور میں دیکھ چکے ہیں؟ یا خود مجلس قانون ساز جس کے ارکان ابھی اپنی پارٹی کے پارلیمنٹری بورڈ کی پیش کی ہوئی فہرست پر آنکھیں بند کرکے ووٹ دیا کرتے ہیں؟ اگر یہی دونوں طریقے مجلس علماء کے انتخاب کے ہیں، تو ان میں سے کوئی بھی ایسا طریقہ نہیں ہے جس سے حق پرست اور خدا ترس علماء کے منتخب ہونے کی امید کی جا سکے۔

اب صرف تیسری صورت ہی رہ جاتی ہے اور ہم بحالت موجودہ اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ ہم یہ جانتے ہیں کہ ہمارے جج بالعموم دین کا علم نہیں رکھتے، اور ان میں سے اکثر کے ذاتی رجحانات بھی ہمارے نزدیک قابل اطمینان نہیں ہیں، مگر اس کے باوجود ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے ملک کے جج سیاسی لیڈروں کی بہ نسبت زیادہ ایماندار ہیں، اور ہمیں یہ اعتماد ہے کہ اگر ایک منصف کی حیثیت سے ان کے سامنے کسی قانون کے موافق کتاب و سنت یا مخالف کتاب و سنت ہونے کا سوال پیش ہو، تو وہ انشاء اللہ فریقین کے دلائل کا موازنہ کرکے ہی فیصلہ دیں گے، اپنی ذاتی خواہشات پر کوئی من مانا حکم نہیں لگا دینگے۔

دوسرا اعتراض ہماری اس تجویز پر کیا گیا ہے کہ سرکاری افسروں کے خلاف عوام الناس کو عدالتوں سے چارہ جوئی کرنے کا غیر مشروط حق دیا جائے اور اس راہ سے وہ قیود ہٹا دی جائیں جو انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت میں عائد کی تھیں۔ اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس طرح تو سرکاری افسروں کے لیے اپنے فرائض منصبی انجام دینا مشکل ہو جائے گا۔

اس اعتراض کا مختصر جواب تو ہماری انہی تجاویز میں موجود ہے لیکن پوری صورتِ معاملہ کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا پس منظر وضاحت کے ساتھ لوگوں کے سامنے آ جائے۔

انگریزی حکومت نے اپنے دور میں جو ضابطۂ فوجداری مرتب کیا تھا، اس کی دفعہ ۱۹۷ یہ تھی کہ

تین قسم کے سرکاری ملازم اگر اپنے فرائض منصبی انجام دیتے ہوئے کسی جرم یا تعدی کے مرتکب ہوں تو لوکل گورنمنٹ کی اجازت کے بغیر ان کے خلاف کوئی عدالت کسی درخواست یا استغاثے کی سماعت نہیں کر سکتی۔ ایک جج جو تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۹ کے معنی میں جج ہو، دوسرے مجسٹریٹ، تیسرے کوئی ایسا عہدہ دار جو لوکل گورنمنٹ یا اس سے اونچے درجے کی حکومت کے حکم یا منظوری کے بغیر اپنے عہدے سے نہ ہٹایا جا سکتا ہو۔ علاوہ بریں یہ دفعہ لوکل گورنمنٹ ہی کو یہ اختیار دیتی تھی کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ کس جرم یا جرائم پر کون کس طریقے سے کارروائی کریگا اور کونسی عدالت اس کی سماعت کرے گی۔ اس کے بعد ۱۹۳۷ء میں اس کے اندر یہ ترمیم کی گئی کہ مرکزی حکومت کے ملازمین کے معاملے میں ان اختیارات کو گورنر جنرل، اور صوبائی ملازمین کے معاملے میں گورنر، (اپنی انفرادی رائے سے نہ کہ اپنے وزراء کے مشورے سے) استعمال کریں گے۔

اسی طرح انہوں نے ضابطۂ دیوانی کی دفعہ ۸۰ میں یہ رکھا تھا کہ کسی عدالت میں کسی سرکاری افسر کے خلاف کسی ایسے معاملے سے متعلق جو اس نے اپنی سرکاری حیثیت میں کیا ہو کوئی دعویٰ اس وقت تک دائر نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ ادخالِ دعویٰ سے دو مہینے پہلے اُس افسر کو اس امر کی باقاعدہ اطلاع نہ دے دی گئی ہو کہ اس کے خلاف کیا شکایت ہے، اور شکایت کرنے والا کس قسم کی دادرسی چاہتا ہے، اور شکایت کرنے والے کا نام اور پتہ کیا ہے۔ پھر دفعہ ۸۲ میں یہ تھا کہ اگر عدالت اس طرح کے مقدمہ میں مدعا علیہ کے خلاف ڈگری دے اور مدتِ مقررہ کے اندر اس کی تعمیل نہ ہو تو عدالت اس کی رپورٹ لوکل گورنمنٹ کو بھیجے گی اور اجرائے ڈگری کا حکم اس وقت تک نہ دیا جا سکے گا جب تک کہ اس رپورٹ پر تین مہینے نہ گزر جائیں۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے سرکاری ملازموں کو اس طرح کا تحفظ خود انگلستان میں حاصل نہ تھا۔ مگر ہندوستان میں انگریزوں نے یہ تحفظ ان کو اس لیے فراہم کر کے دیا کہ دراصل یہاں وہ پبلک کے ملازم نہ تھے بلکہ بیرونی آقاؤں کے ملازم تھے، اور غلام پبلک پر حکومت اور اس کے کارکنوں کا دبدبہ بٹھانے

کے لیے ایسے تحفظ کی ضرورت تھی۔ حکومت یہ چاہتی تھی کہ جن ملازموں کے ذریعہ سے وہ اس پبلک کو دبا کر رکھتی ہے، وہ اگر قانونی اختیارات سے تجاوز کر کے بھی اس پبلک کی جان، مال یا آبرو پر دست درازی کریں تو اسے ان کے خلاف براہِ راست عدالتوں سے چارہ جوئی کا موقع حاصل نہ ہو بلکہ حکومت کے سب سے بڑے ایجنٹوں (گورنر جنرل اور گورنروں) سے اجازت لے کر ہی ان پر کوئی دعویٰ کیا جا سکے۔

یہ نظریہ قیام پاکستان سے پہلے تو اپنی کوئی منطقی بنیاد رکھتا تھا خواہ وہ منطق وحشیانہ طاقت کی منطق ہی سہی۔ مگر جب قیام پاکستان کے بعد ہماری دستور ساز اسمبلی کی مقرر کردہ کمیٹی نے بنیادی اصولوں کے متعلق اپنی ابتدائی رپورٹ پیش کی تو ہم اس میں یہ مضمون دیکھ کر حیران رہ گئے کہ "سرکاری افسروں کو جو تحفظات ضابطۂ فوجداری و دیوانی کی مذکورۂ بالا دفعات میں دیے گئے ہیں ان میں ترمیم، تنسیخ یا تحدید کی غرض سے کوئی بل کسی مرکزی یا صوبائی مجلس قانون ساز میں صدرِ مملکت یا صدرِ صوبہ کی اجازت کے بغیر پیش نہیں ہو سکتا۔" آزادی کے بعد اس عجیب و غریب تجویز کے اندر کوئی منطق ہمیں نظر نہ آسکی، الا یہ کہ حکومت کا بنیادی نظریہ اب بھی وہی ہو جو ضابطۂ فوجداری اور ضابطۂ دیوانی کی تدوین کے وقت تھا۔ اس تجویز کو اگر اب قبول کیا جاتا ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ ملازمین جس طرح پہلے پبلک کے ملازم نہ تھے اسی طرح اب بھی نہیں ہیں۔ پہلے یہ شاہ برطانیہ کے ملازم تھے، اب "صدرِ مملکت" نامی ایک بادشاہ کے ملازم ہیں۔ پہلے ان کا کام انگریز کے لیے "دیسی" لوگوں کو دبا کر رکھنا تھا، اب ان کا کام خود دیسی آقاؤں کے لیے انہیں دبا کر رکھنا ہے۔ پبلک کے نمائندے پہلے بھی ان کے حقوق و امتیازات پر ہاتھ ڈالنے کے مجاز نہ تھے، اب بھی وہ ان کے اصل آقا یعنی صدرِ مملکت سے پوچھے بغیر کوئی ایسا بل نہیں لا سکتے جو ان حقوق و امتیازات میں کوئی کمی کرتا ہو۔ پبلک پہلے بھی سرچشمۂ اقتدار نہ تھی، اب بھی اس کی وہی غلامانہ حیثیت برقرار ہے، ورنہ اُس کی نمائندہ اسمبلی کا اسی کے ملازموں کے بارے میں کسی بل پر بحث نہ کر سکنا کیا معنی؟ اور یہ صدرِ مملکت صاحب ہوتے کون ہیں کہ پبلک کے نمائندے پبلک ملازمین کے بارے میں ان سے پوچھ کر کوئی بل لائیں؟

ہمارا اولین اعتراض تو اس سراسر نامعقول اور بیہودہ تجویز پر ہے۔ دوسرا اصولی اعتراض ہمیں بجائے خود اُن دفعات پر ہے جو ضابطۂ فوجداری اور ضابطۂ دیوانی میں اب تک موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی سرکاری افسر اپنی سرکاری ڈیوٹی انجام دیتے ہوئے کسی ایسی زیادتی کا مرتکب ہوتا ہے جس کا وہ ازروئے قانون مجاز نہیں ہے، تو آخر کیوں حکومت سے پوچھے بغیر اس کے خلاف فوجداری استغاثہ نہ کیا جا سکے؟ اور کیوں اس پر دیوانی دعویٰ کرنے سے پہلے ۶۰ دن کے نوٹس کی ضرورت ہو؟ پبلک کے دوسرے آدمیوں کی ایسی ہی زیادتیوں پر استغاثہ کرنے کے لیے ان حدود و قیود کی ضرورت کیوں نہیں ہے، اور ان افسر صاحبان میں کیا سُرخاب کے پَر لگے ہوئے ہیں کہ ان کے معاملے میں اس کی ضرورت ہے؟ آپ کہتے ہیں کہ اگر پبلک کو اس طرح سرکاری افسروں کے خلاف دعوے اور استغاثے کرنے کی کھلی اجازت دے دی جائے تو ان کے لیے کام کرنا مشکل ہو جائے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ تو ایک مفروضہ پیش کرتے ہیں، اور یہاں حال یہ ہے کہ افسروں نے اس بیجا تحفظ کی بدولت پبلک کے لیے جینا مشکل کر دیا ہے۔ آخر یہ اسی تحفظ کا نتیجہ تو ہے کہ پاکستان کے ایک گاؤں پر پولیس کے سپاہی چند اعلیٰ افسروں کے اشارے پر سکھوں اور سیوا سنگھیوں کی طرح ٹوٹ پڑے، انہوں نے صرف جانوں اور مالوں ہی پر ہاتھ نہ ڈالا بلکہ گاؤں بھر کی عورتوں کی آبروریزی کر ڈالی، اور ایک افسر نے علانیہ کہا کہ اس گاؤں کی آئندہ نسل صرف سپاہیوں کی نسل ہی ہونی چاہیے، مگر اس کے باوجود ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جا سکی، صرف اس لیے کہ خود پبلک کے مظلوم لوگ حکومت کی اجازت کے بغیر ان افسروں پر استغاثہ نہ کر سکتے تھے، اور حکومت (جو خود پولیس ہی کی بدولت برسرِ اقتدار آئی تھی) اپنی پولیس کتنے وفادار کو اپنی قوم کی عورتوں کی عصمت سے زیادہ قیمتی سمجھتی تھی۔ اِن شرمناک واقعات کے بعد کوئی شریف آدمی کس منہ سے یہ کہہ سکتا ہے کہ اِن سرکاری افسروں کو کام کرنے کے لیے اِس قسم کے تحفظ کی ضرورت ہے؟ اس طرح کا تحفظ تو کام کرنے کے لیے نہیں بلکہ بدمعاشی کرنے کے لیے مددگار ہوتا ہے۔ کام کے لیے اِس سے زیادہ کسی تحفظ کی ضرورت نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص کسی سرکاری افسر کے خلاف بیجا استغاثہ کرے تو اس کے لیے کوئی سزا تجویز کر دی جائے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اگر کسی سرکاری افسر کے خلاف حاکمانہ اختیارات کے بیجا استعمال کا جرم ثابت ہو جائے تو اس کو دوسرے ایسے

ہی مجرموں کی بہ نسبت دوگنی سزا دی جائے ۔

اس سلسلہ میں ایک صاف اور سیدھا سوال یہ ہے کہ حقیقت میں تحفظ کی ضرورت کس کو زیادہ ہے ؟ حکومت کے اُن افسروں کو جنہیں پہلے ہی حاکمانہ دبدبہ و اقتدار حاصل ہے اور جن کی پشت پر نظم و نسق کی پوری طاقت ہے ؟ یا اُن عوام کو جو اُن کے مقابلے میں پہلے ہی دبے ہوئے ہیں ؟ کوئی معقول آدمی اس سوال کا یہ جواب نہیں دے سکتا کہ تحفظ کی ضرورت عوام کی بہ نسبت حکام کو زیادہ ہے ۔ لیکن اگر ہمارے دستور ساز حضرات اس معاملے میں یہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں کہ سرکاری افسروں کو مزید تحفظ کی ضرورت ہے اور عوام کو اس کی ضرورت نہیں ہے ، تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ عقل اور انصاف سے ہی کورے نہیں ہیں بلکہ دغاباز بھی ہیں کہ نمائندگی کا پروانہ تو انہوں نے لیا عوام سے اور پھر دستور سازی کرنے بیٹھ گئے حکومت اور اس کے کارپردازوں کے مفاد میں ۔ دراصل اس طرح کی دستور سازی اس ملک میں نازیوں کے " ہیرن فوک " کی طرح ایک " ملاء اعلیٰ " وجود میں لائے گی جس پر " عوام کالانعام " کی جانیں اور ان کے مال اور ان کی بہنوں اور بیٹیوں اور بیویوں کی عصمتیں مباح ہونگی ۔ ایسا دستور سوچنے اور بنانے والے اگر نازیوں کے انجام سے کوئی سبق نہیں سیکھ سکتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کے " ہیرن فوک " کو خود وہی انجام دکھا دے گا ۔

تیسرا اعتراض ہماری اس تجویز پر کیا گیا ہے کہ عورتوں کو مجالس قانون ساز کا رکن نہ ہونا چاہیے ۔ اس باب میں ہم سے پوچھا گیا ہے کہ وہ کون سے اسلامی اصول ہیں جو ان کی رکنیت میں مانع ہیں اور قرآن و حدیث کے وہ کونسے ارشادات ہیں جو ان مجالس کی رکنیت کو مردوں کے لیے مخصوص قرار دیتے ہیں ؟ ۔

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم اُن مجالس کی صحیح نوعیت اچھی طرح واضح کر دیں جن کی رکنیت کے لیے عورتوں کے استحقاق پر گفتگو کی جا رہی ہے ۔ ان مجالس کا نام مجالس قانون ساز رکھنے سے یہ

غلط فہمی واقع ہوتی ہے کہ ان کا کام صرف قانون بنانا ہے، اور پھر یہ غلط فہمی ذہن میں رکھ کر جب آدمی دیکھتا ہے کہ عہد صحابہ میں خواتین بھی قانونی مسائل پر بحث، گفتگو، اظہار رائے، سب کچھ کرتی تھیں اور بسا اوقات خود خلفاء ان کی رائے لیتے اور اس رائے کا لحاظ کرتے تھے، تو اسے حیرت ہوتی ہے کہ آج اسلامی اصول کا نام لے کر اس قسم کی مجالس میں عورتوں کی شرکت کو غلط کیسے کہا جا سکتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں جو مجالس اس نام سے موسوم کی جاتی ہیں ان کا کام محض قانون سازی کرنا نہیں ہے بلکہ عملاً وہی پوری ملکی سیاست کو کنٹرول کرتی ہیں، وہی وزارتیں بناتی اور توڑتی ہیں، وہی نظم و نسق کی پالیسی طے کرتی ہیں وہی مالیات اور معاشیات کے مسائل طے کرتی ہیں، اور انہی کے ہاتھ میں صلح و جنگ کی زمام کار ہوتی ہے۔ اس حیثیت سے ان مجالس کا مقام محض ایک فقیہ اور مفتی کا مقام نہیں ہے بلکہ پوری مملکت کے "قوام" کا مقام ہے۔

اب ذرا دیکھیے، قرآن اجتماعی زندگی میں یہ مقام کس کو دیتا ہے اور کسے نہیں دیتا۔ سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ، فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ (رکوع-۶)	مرد عورتوں پر قوام ہیں، بوجہ اس فضیلت کے جو اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر دی ہے، اور بوجہ اس کے کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ پس صالح عورتیں اطاعت شعار اور غیب کی حفاظت کرنے والیاں ہوتی ہیں اللہ کی حفاظت کے تحت۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ صاف الفاظ میں قوامیت کا مقام مردوں کو دے رہا ہے اور صالح عورتوں کی دو خصوصیات بیان کرتا ہے، ایک یہ کہ وہ اطاعت شعار ہوں، دوسرے یہ کہ وہ مردوں کی غیر موجودگی میں اُن چیزوں کی حفاظت کریں جن کی حفاظت اللہ کرانا چاہتا ہے

آپ کہیں گے کہ یہ حکم تو خانگی معاشرت کے لیے ہے نہ کہ ملکی سیاست کے لیے۔ مگر یہاں اوّل تو

مطلقاً اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ کہا گیا ہے، فی البیوت کے الفاظ ارشاد نہیں ہوئے ہیں جن کو بڑھائے بغیر اس حکم کو خانگی معاشرت تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ پھر اگر آپ کی یہ بات مان بھی لی جائے تو ہم پوچھتے ہیں کہ جسے اللہ نے گھر میں قوام نہ بنایا بلکہ قنوت (اطاعت شعاری) کے مقام پر رکھا، آپ اسے تمام گھروں کے مجموعے، یعنی پوری مملکت میں قنوت کے مقام سے اٹھا کر قوامیت کے مقام پر لانا چاہتے ہیں؟ گھر کی قوامیت سے مملکت کی قوامیت تو زیادہ بڑی اور اونچے درجے کی ذمہ داری ہے۔ اب کیا اللہ کے متعلق آپ کا یہ گمان ہے کہ وہ ایک گھر میں تو عورت کو قوام نہ بنائے گا مگر کئی لاکھ گھروں کے مجموعے پر اسے قوام بنا دے گا؟

اور دیکھیے، قرآن صاف الفاظ میں عورت کا دائرۂ عمل یہ کہہ کر معین کر دیتا ہے کہ

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ (الاحزاب-۳۳)	اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ ٹھیری رہو اور پچھلی جاہلیت کے سے تبرج کا ارتکاب نہ کرو۔

آپ پھر فرمائیں گے کہ یہ حکم تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی خواتین کو دیا گیا تھا۔ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ آپ کے خیال مبارک میں کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی خواتین کے اندر کوئی خاص نقص تھا جس کی وجہ سے وہ بیرونِ خانہ کی ذمہ داریوں کے لیے نااہل تھیں؟ اور کیا دوسری خواتین کو اس لحاظ سے اُن پر کوئی فوقیت حاصل ہے؟ پھر اگر اس سلسلے کی ساری آیات صرف اہل بیتِ نبوت کے لیے مخصوص ہیں تو کیا دوسری مسلمان عورتوں کو تبرجِ جاہلیت کی اجازت ہے؟ اور کیا انہیں غیر مردوں سے اس طرح باتیں کرنے کی بھی اجازت ہے کہ اُن کے دل میں طمع پیدا ہو؟ اور کیا اللہ اپنے نبیؐ کے گھر کے سوا ہر مسلمان گھر کو "رجس" میں آلودہ دیکھنا چاہتا ہے؟

اس کے بعد حدیث کی طرف آیئے۔ یہاں ہم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ واضح ارشادات ملتے ہیں:

اِذَا کَانَ اُمَرَاؤُکُمْ شِرَارَکُمْ وَاَغْنِیَاؤُکُمْ	جب تمہارے امراء تمہارے بدترین لوگ ہوں، اور

بُخَلَاءَكُمْ وَاُمُوْرُكُمْ اِلٰی نِسَاءِكُمْ فَبَطْنُ الْاَرْضِ خَیْرٌ مِّنْ ظَھْرِھَا (ترمذی)

جب تمہارے دولتمند بخیل ہوں اور جب تمہارے معاملات تمہاری عورتوں کے ہاتھ میں ہوں تو زمین کا پیٹ تمہارے لیے اس کی پیٹھ سے بہتر ہے۔

عَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ لَمَّا بَلَغَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّ اَھْلَ فَارِسَ مَلَّکُوْا عَلَیْھِمْ بِنْتَ کِسْرٰی قَالَ لَنْ یُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَھُمْ اِمْرَاَۃً (بخاری، احمد، نسائی، ترمذی)

ابوبکرہ سے روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی کہ ایران والوں نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا بادشاہ بنا لیا ہے تو آپ نے فرمایا وہ قوم کبھی فلاح نہیں پا سکتی جس نے اپنے معاملات ایک عورت کے سپرد کیے ہوں

یہ دونوں حدیثیں اللہ تعالیٰ کے ارشاد اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ کی ٹھیک ٹھیک تفسیر بیان کرتی ہیں اور ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سیاست و ملک داری عورت کے دائرۂ عمل سے خارج ہے رہا یہ سوال کہ عورت کا دائرۂ عمل ہے کیا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات اُس کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں:۔

وَالْمَرْاَۃُ رَاعِیَۃٌ عَلٰی بَیْتِ بَعْلِھَا وَوُلْدِہٖ وَھِیَ مَسْئُوْلَۃٌ عَنْھُمْ (ابوداؤد)

اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی راعیہ ہے اور وہ ان کے بارے میں جواب دہ ہے۔

یہ ہے آیت وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ کی صحیح تفسیر، اور اس کی مزید تفسیر وہ احادیث ہیں جن میں عورت کو سیاست و ملک داری سے کم تر درجہ کے خارج از بیت فرائض و واجبات سے بھی مستثنیٰ کیا گیا ہے

اَلْجُمُعَۃُ حَقٌّ وَاجِبٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ فِیْ جَمَاعَۃٍ اِلَّا اَرْبَعَۃً: عَبْدٌ مَّمْلُوْکٌ، اَوِ امْرَاَۃٌ، اَوْ صَبِیٌّ، اَوْ مَرِیْضٌ۔ (ابوداؤد)

جمعہ ہر مسلمان پر جماعت کے ساتھ ادا کرنا حق اور واجب ہے بجز چار کے، غلام، عورت، بچہ اور مریض۔

عَنْ اُمِّ عَطِیَّۃَ قَالَتْ نُھِیْنَا عَنْ اِتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ۔ (بخاری)

ام عطیہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا ہم کو جنازوں کے ساتھ جانے سے روک دیا گیا تھا۔

اگرچہ ہمارے پاس اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں مضبوط عقلی دلائل بھی ہیں، اور کوئی چیلنج کرے تو ہم انہیں پیش کر سکتے ہیں، مگر اول تو ان کے بارے میں سوال نہیں کیا گیا ہے، دوسرے ہم کسی مسلمان کا یہ حق ماننے کے لیے تیار بھی نہیں ہیں کہ وہ خدا اور رسول کے واضح احکام سننے کے بعد ان کی تعمیل کرنے سے پہلے، اور تعمیل کے لیے شرط کے طور پر، عقلی دلائل کا مطالبہ کرے۔ مسلمان کو، اگر وہ واقعی مسلمان ہے، پہلے حکم کی تعمیل کرنی چاہیے، پھر وہ اپنے دماغی اطمینان کے لیے عقلی دلائل مانگ سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ کہتا ہے کہ مجھے پہلے عقلی حیثیت سے مطمئن کرو ورنہ میں خدا اور رسولؐ کا حکم نہ مانوں گا تو ہم اسے سرے سے مسلمان ہی نہیں مانتے، کجا کہ اس کو ایک اسلامی ریاست کے لیے دستور بنانے کا مجاز تسلیم کریں۔ تعمیلِ حکم کے لیے عقلی دلیل مانگنے والے کا مقام اسلام کی سرحد سے باہر ہے نہ کہ اس کے اندر!

سیاست و ملک داری میں عورت کے دخل کو جائز ٹھیرانے والے اگر کوئی دلیل رکھتے ہیں تو وہ بس یہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت عثمانؓ کے خون کا دعویٰ لے کر اٹھیں اور حضرت علیؓ کے خلاف جنگِ جمل میں نبرد آزما ہوئیں۔ مگر اول تو یہ دلیل اصولاً ہی غلط ہے۔ اس لیے کہ جس مسئلے میں اللہ اور اس کے رسول کی واضح ہدایت موجود ہو اُس میں کسی صحابی کا کوئی ایسا انفرادی فعل جو اس ہدایت کے خلاف نظر آتا ہو ہرگز حجت نہیں بن سکتا۔ صحابہ کی پاکیزہ زندگیاں بلاشبہ ہمارے لیے مشعلِ ہدایت ہیں، مگر اس غرض کے لیے کہ ہم ان کی روشنی میں اللہ اور رسول کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں، نہ اس غرض کے لیے کہ ہم اللہ اور رسول کی ہدایت چھوڑ کر ان میں سے کسی کی انفرادی لغزشوں کا اتباع کریں۔ پھر جس فعل کو اُسی زمانے میں جلیل القدر صحابہؓ نے غلط قرار دیا تھا، اور جس پر بعد میں خود ام المومنینؓ بھی نادم ہوئیں، اسے آخر کس طرح اسلام میں ایک نئی بدعت کا آغاز کرنے کے لیے دلیل قرار دیا جا سکتا ہے؟

حضرت عائشہؓ کے اس اقدام کی اطلاع پاتے ہی ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے ان کو جو خط لکھا تھا وہ پورا کا پورا ابن قتیبہ نے الامامۃ والسیاسۃ اور ابن عبد ربہ نے عقد الفرید میں نقل کیا ہے۔ اسے ملاحظہ فرمائیے۔ کتنے پُرزور الفاظ میں وہ فرماتی ہیں کہ: "آپ کے دامن کو قرآن نے ربا تی ۲۵ پر)

تفہیم القرآن

بنی اسرائیل

(۷)

تمہارا (حقیقی) رب تو وہ ہے جو سمندر میں تمہاری کشتی چلاتا ہے[1] تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو[2]۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمہارے حال پر نہایت مہربان ہے۔ جب سمندر میں تم پر مصیبت آتی ہے تو اُس ایک کے سوا دوسرے جن جن کو تم پکارا کرتے ہو وہ سب گُم ہو جاتے ہیں،[3] مگر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پر

[1] اوپر کے سلسلۂ بیان سے اس کا تعلق سمجھنے کے لیے اس رکوع کے ابتدائی مضمون پر پھر ایک نگاہ ڈال لی جائے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ابلیس اول روزِ آفرینش سے اولادِ آدم کے پیچھے پڑا ہُوا ہے تاکہ اس کو آرزوؤں اور تمناؤں اور جھوٹے وعدوں کے دام میں پھانس کر راہِ راست سے ہٹائے جائے اور یہ ثابت کردے کہ وہ اُس بزرگی کا مستحق نہیں ہے جو اسے خدا نے عطا کی ہے۔ اس خطرے سے اگر کوئی چیز انسان کو بچا سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ انسان اپنے رب کی بندگی پر ثابت قدم رہے اور ہدایت و اعانت کے لیے اُسی کی طرف رجوع کرے اور اسی کو اپنا وکیل (یعنی توکّل) بنائے۔ اس کے سوا دوسری جو راہ بھی انسان اختیار کرے گا، شیطان کے پھندوں سے نہ بچ سکے گا۔ اس تقریر سے یہ بات خود بخود نکل آئی کہ جو لوگ توحید کی دعوت کو رد کر رہے ہیں اور شرک پر اصرار کیے جاتے ہیں وہ دراصل آپ ہی اپنی تباہی کے درپے ہیں۔ اسی مناسبت سے یہاں توحید کا اثبات اور شرک کا ابطال کیا جا رہا ہے۔

[2] یعنی اُن معاشی اور تمدنی اور علمی و ذہنی فوائد سے متمتع ہونے کی کوشش کرو جو بحری سفروں سے حاصل ہوتے ہیں۔

[3] یعنی یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تمہاری اصلی فطرت ایک خدا کے سوا کسی رب کو نہیں جانتی، اور تمہارے اپنے دل کی گہرائیوں میں یہ شعور موجود ہے کہ نفع و نقصان کے حقیقی اختیارات کا مالک بس وہی ایک ہے۔ ورنہ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ جو اصل وقت دستگیری کا ہے اُس وقت تم کو ایک خدا کے سوا کوئی دوسرا دستگیر نہیں سُوجھتا؟

پہنچا دینا ہے تو تم اُس سے منہ موڑ جاتے ہو۔ انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے۔ اچھا، تو کیا تم اِس بات سے بالکل بے خوف ہو کہ خدا کبھی خشکی پر ہی تم کو زمین میں دھنسا دے یا تم پر پتھراؤ کرنے والی آندھی بھیج دے اور تم اس سے بچانے والا کوئی حمایتی نہ پاؤ؟ اور کیا تمہیں اِس کا کوئی اندیشہ نہیں کہ خدا پھر کسی وقت سمندر میں تم کو لے جائے اور تمہاری ناشکری کے بدلے تم پر سخت طوفانی ہوا لے آئے اور تم کو ایسا کوئی نہ ملے جو اُس سے تمہارے اِس انجام کی پوچھ گچھ کر سکے؟ —— یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی[1]۔ پھر خیال کرو اُس دن کا جب کہ ہم ہر انسانی ع
گروہ کو اس کے پیشوا کے ساتھ بلائیں گے۔ اس وقت جن لوگوں کو ان کا نامۂ اعمال سیدھے ہاتھ میں دیا گیا وہ اپنا کارنامہ پڑھیں گے[2] اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ اور جو اِس دنیا میں اندھا بن کر رہا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا بلکہ راستہ پانے میں اندھے سے بھی زیادہ ناکام۔

اِن لوگوں نے اِس کوشش میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی کہ تجھے فتنے میں ڈال کر اُس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تیری طرف بھیجی ہے تاکہ تو ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ دے[3]۔ اگر تو ایسا کرتا تو

---

[1] یعنی یہ ایک بالکل کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نوعِ انسانی کو زمین اور اس کی اشیاء پر یہ اقتدار کسی جن یا فرشتے یا سیارے نے نہیں عطا کیا ہے، نہ کسی ولی یا نبی نے اپنی نوع کو یہ اقتدار دلوایا ہے۔ یقیناً یہ اللہ ہی کی بخشش اور اس کا کرم ہے۔ پھر اس سے بڑھ کر حماقت اور جہالت کیا ہو سکتی ہے کہ انسان اس مرتبے پر فائز ہو کر اللہ کے بجائے اس کی مخلوق کے آگے جھکے۔

[2] یہ بات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کی گئی ہے کہ قیامت کے روز نیک لوگوں کو ان کا نامۂ اعمال سیدھے ہاتھ میں دیا جائیگا اور وہ خوشی خوشی اسے دیکھیں گے، بلکہ دوسروں کو بھی دکھائیں گے۔ رہے بد اعمال لوگ تو ان کا نامۂ سیاہ ان کو بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور وہ اسے بینتے ہی پیٹھ پیچھے چھپانے کی کوشش کریں گے۔ ملاحظہ ہو سورۃ الحاقہ آیت ۱۹-۲۸۔ اور سورۃ انشقاق آیت ۷-۱۲۔

[3] یہ اُن حالات کی طرف اشارہ ہے جو پچھلے دس بارہ سال سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکے میں (باقی صفحہ ۳۷ پر)

وہ تجھے اپنا دوست بنا لیتے۔ اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تجھے مضبوط نہ رکھتے تو تُو ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتا۔ لیکن اگر تو ایسا کرتا تو ہم تجھے دُنیا میں بھی دُہرے عذاب کا مزہ چکھاتے اور آخرت میں بھی دُہرے عذاب کا، پھر ہمارے مقابلے میں تو کوئی مددگار نہ پاتا۔[۵]

اور یہ لوگ اس بات پر بھی تُلے رہے ہیں کہ تیرے قدم اِس سرزمین سے اکھاڑ دیں اور تجھے یہاں سے نکال باہر کریں۔ لیکن اگر یہ ایسا کریں گے تو تیرے بعد یہ خود یہاں کچھ زیادہ دیر نہ ٹھیر سکیں گے۔[۶]

(بقیہ حاشیہ ۴ ص ۱۴) پیش آ رہے تھے۔ کفارِ مکہ کی یہ کوشش ہی کہ جس طرح بھی ہو آپ کو توحید کی اُس دعوت سے ہٹا دیں جسے آپ پیش کر رہے تھے اور کسی نہ کسی طرح آپ کو مجبور کر دیں کہ آپ ان کے شرک اور رسومِ جاہلیت سے کچھ نہ کچھ مصالحت کر لیں۔ اس غرض کے لیے انہوں نے آپ کو فتنے میں ڈالنے کی ہر کوشش کی۔ فریب بھی دیے، لالچ بھی دلائے، دھمکیاں بھی دیں، جھوٹے پروپیگنڈے کا طوفان بھی اٹھایا، ظلم و ستم بھی کیا، معاشی دباؤ بھی ڈالا، معاشرتی مقاطعہ بھی کیا، اور وہ سب کچھ کر ڈالا جو کسی انسان کے عزم کو شکست دینے کے لیے کیا جا سکتا تھا۔

۵؎ اللہ تعالیٰ اس ساری روداد پر تبصرہ کرتے ہوئے دو باتیں ارشاد فرماتا ہے۔ ایک یہ کہ اگر تم حق کو حق جان لینے کے بعد باطل سے کوئی سمجھوتہ کر لیتے تو یہ بگڑی ہوئی قوم تو ضرور تم سے خوش ہو جاتی، مگر خدا کا غضب تم پر بھڑک اٹھتا اور تمہیں دنیا و آخرت، دونوں میں دُہری سزا دی جاتی۔ دوسرے یہ کہ انسان خواہ وہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہو، خود اپنے بل بوتے پر باطل کے ان طوفانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا جب تک کہ اللہ کی مدد اور اس کی توفیق شاملِ حال نہ ہو۔ یہ سراسر اللہ کا بخشا ہوا صبر و ثبات تھا جس کی بدولت نبی صلی اللہ علیہ وسلم حق و صداقت کے موقف پر پہاڑ کی طرح جمے رہے اور کوئی سیلابِ بلا آپ کو بال برابر بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکا۔

۶؎ یہ صریح پیشینگوئی ہے جو اُس وقت تو صرف ایک دھمکی نظر آتی تھی، مگر دس گیارہ سال کے اندر ہی حرف بحرف سچی ثابت ہو گئی۔ اس سورت کے نزول پر ایک سال گزرا تھا کہ کفارِ مکہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وطن سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ اور اس پر ۸ سال سے زیادہ نہ گزرے تھے کہ آپ فاتح کی حیثیت سے مکۂ معظمہ میں داخل ہوئے۔ اور پھر دو سال کے اندر اندر سرزمینِ عرب مشرکین کے وجود سے پاک کر دی گئی۔ پھر جو بھی اس ملک میں رہا مسلمان بن کر رہا، مشرک بن کر وہاں نہ ٹھیر سکا۔

یہ ہمارا مستقل طریقِ کار ہے جو اُن سب رسولوں کے معاملے میں ہم نے برتا ہے جنہیں تجھ سے پہلے ہم نے بھیجا تھا،[1] اور ہمارے طریقِ کار میں تُو کوئی تغیر نہ پائے گا۔ع

نماز قائم کرو[2] زوالِ آفتاب[3] سے لے کر رات کے اندھیرے تک[4] اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو[5]

---

[1] یعنی سارے انبیاء کے ساتھ اللہ کا یہی معاملہ رہا ہے کہ جس قوم نے ان کو قتل یا جلاوطن کیا، پھر وہ زیادہ دیر تک اپنی جگہ نہ ٹھیر سکی۔ پھر یا تو خدا کے عذاب نے اسے ہلاک کیا، یا کسی دشمن قوم کو اس پر مسلط کیا گیا، یا خود اسی نبی کے پیرووں سے اُس کو مغلوب کرا دیا گیا۔

[2] مشکلات و مصائب کے اس طوفان کا ذکر کرنے کے بعد فوراً ہی نماز قائم کرنے کا حکم دے کر اللہ تعالیٰ نے یہ لطیف اشارہ فرمایا ہے کہ وہ ثابت قدمی جو ان حالات میں ایک مومن کو درکار ہے اقامتِ صلوٰۃ سے حاصل ہوتی ہے۔

[3] "زوالِ آفتاب" ہم نے دلوک الشمس کا ترجمہ کیا ہے۔ اگرچہ بعض صحابہ و تابعین نے دلوک سے مراد غروب بھی لیا ہے، لیکن اکثریت کی رائے یہی ہے کہ اس سے مراد آفتاب کا نصف النہار سے ڈھل جانا ہے۔ حضرت عمرؓ، ابن عمرؓ، انس بن مالکؓ، ابو برزۃ الاسلمیؓ، حسن بصریؒ، شعبیؒ، عطاءؒ، مجاہدؒ اور ایک روایت کی رو سے ابن عباسؓ بھی اسی کے قائل ہیں۔ امام محمد باقرؒ اور امام جعفر صادقؒ سے بھی یہی قول مروی ہے۔ بلکہ بعض احادیث میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی دلوکِ شمس کی یہی تشریح منقول ہے، اگرچہ ان کی سند کچھ زیادہ قوی نہیں ہے۔

[4] غسق اللیل بعض کے نزدیک "رات کا پوری طرح تاریک ہو جانا" ہے، اور بعض اس سے نصفِ شب مراد لیتے ہیں۔ اگر پہلا قول تسلیم کیا جائے تو اس سے عشا کا اول وقت مراد ہو گا، اور اگر دوسرا قول صحیح مانا جائے تو پھر یہ اشارہ عشا کے آخر وقت کی طرف ہے۔

[5] فجر کے قرآن سے مراد فجر کی نماز ہے۔ قرآن مجید میں نماز کے لیے کہیں تو صلوٰۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے اور کہیں اس کے مختلف اجزاء میں سے کسی جز کا نام لے کر پوری نماز مراد لی گئی ہے، مثلاً تسبیح، حمد، ذکر، قیام، قعود، رکوع، سجود وغیرہ۔ اسی طرح یہاں فجر کے وقت قرآن پڑھنے کا مطلب محض قرآن پڑھنا نہیں بلکہ نماز میں قرآن پڑھنا ہے۔ اس طریقہ سے قرآن مجید نے ضمناً یہ اشارہ کر دیا ہے کہ نماز کن اجزاء (باقی صفحہ ۳۲ پر)

کیونکہ قرآنِ فجر مشہود ہوتا ہے۔[1] اور رات کو تہجد پڑھو[2]، یہ تیرے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶) سے مرکب ہونی چاہیے۔ اور انہی اشارات کی رہنمائی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی وہ ہیئت مقرر فرمائی جو مسلمانوں میں رائج ہے۔

قرآنِ فجر کے مشہود ہونے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے فرشتے اس کے گواہ بنتے ہیں، جیسا کہ احادیث میں بتصریح بیان ہوا ہے۔ اگرچہ فرشتے ہر نماز اور ہر نیکی کے گواہ ہیں، لیکن جب خاص طور پر نمازِ فجر کی قرأت پر ان کی گواہی کا ذکر کیا گیا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسے ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فجر کی نماز میں طویل قرأت کرنے کا طریقہ اختیار فرمایا اور اسی کی پیروی صحابۂ کرام نے کی اور بعد کے ائمہ نے اسے مستحب قرار دیا۔

[1] اس آیت میں مجملاً یہ بتایا گیا ہے کہ پنجوقتہ نماز، جو معراج کے موقع پر فرض کی گئی تھی، اس کے اوقات کی تنظیم کس طرح کی جائے۔ حکم ہوا کہ ایک نماز تو طلوعِ آفتاب سے پہلے پڑھ لی جائے، اور باقی چار نمازیں زوالِ آفتاب کے بعد سے ظلمتِ شب تک پڑھی جائیں۔ پھر اس حکم کی تشریح کے لیے جبریل علیہ السلام بھیجے گئے جنہوں نے نماز کے ٹھیک ٹھیک اوقات کی تعلیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔ چنانچہ ابوداؤد اور ترمذی میں ابن عباس کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جبریلؑ نے دو مرتبہ مجھ کو بیت اللہ کے قریب نماز پڑھائی۔ پہلے دن ظہر کی نماز ایسے وقت پڑھائی جبکہ سورج ابھی ڈھلا ہی تھا اور سایہ ایک جوتی کے تسمے سے زیادہ دراز نہ تھا، پھر عصر کی نماز ایسے وقت پڑھائی جبکہ ہر چیز کا سایہ اس کے اپنے قد کے برابر تھا، پھر مغرب کی نماز ٹھیک اس وقت پڑھائی جبکہ روزہ دار روزہ افطار کرتا ہے، پھر عشا کی نماز شفق غائب ہوتے ہی پڑھا دی، اور فجر کی نماز اس وقت پڑھائی جبکہ روزہ دار پر کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے۔ دوسرے دن انہوں نے ظہر کی نماز مجھے اس وقت پڑھائی جبکہ ہر چیز کا سایہ اس کے قد کے برابر تھا، اور عصر کی نماز اس وقت جبکہ ہر چیز کا سایہ اس کے قد سے دوگنا ہو گیا، اور مغرب کی نماز اس وقت جبکہ روزہ دار روزہ افطار کرتا ہے، اور عشا کی نماز ایک تہائی رات گزر جانے پر، اور فجر کی نماز اچھی طرح روشنی پھیل جانے پر۔ پھر جبریلؑ نے پلٹ کر مجھ سے کہا کہ اے محمدؐ یہی اوقات انبیاء کے نماز پڑھنے کے ہیں، اور نمازوں کے صحیح اوقات ان دونوں وقتوں کے درمیان ہیں۔" (یعنی پہلے دن ہر وقت کی ابتدا اور دوسرے دن ہر وقت کی انتہا بتائی گئی ہے اور ہر وقت کی نماز (باقی صفحہ ۳۶ پر)

[2] یہ حاشیہ صفحہ ۳۹ پر دیکھیں۔

لیے نفل ہے، بعید نہیں کہ تیرا رب تجھے مقامِ محمود پر فائز کر دے۔

(بقیہ حاشیہ ص۳۴۷) ان دونوں کے درمیان ادا ہونی چاہیے)۔

قرآن مجید میں خود بھی نماز کے ان پانچوں اوقات کی طرف مختلف مواقع پر اشارے کیے گئے ہیں چنانچہ سورۂ ہود میں فرمایا:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ۔ (رکوع ۱۰)	نماز قائم کرو دن کے دونوں کناروں پر (یعنی فجر اور مغرب) اور کچھ رات گزرنے پر (یعنی عشا)

اور سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوا :۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ (رکوع ۸)	اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کر طلوعِ آفتاب سے پہلے (فجر) اور غروبِ آفتاب سے پہلے (عصر) اور رات کے اوقات میں پھر تسبیح کر (عشا) اور دن کے دونوں سروں پر (یعنی صبح اور مغرب)

پھر سورۂ روم میں ارشاد ہوا :۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِیًّا وَّحِیْنَ تُظْهِرُوْنَ۔ (رکوع ۲)	پس اللہ کی تسبیح کرو جبکہ تم شام کرتے ہو (مغرب) اور جب صبح کرتے ہو (فجر)، اسی کے لیے حمد ہے آسمانوں میں اور زمین میں۔ اور اس کی تسبیح کرو دن کے آخری حصے میں (عصر) اور جبکہ تم دوپہر کرتے ہو (ظہر)

نماز کے اوقات کا یہ نظام مقرر کرنے میں جو مصلحتیں ملحوظ رکھی گئی ہیں ان میں سے ایک اہم مصلحت یہ بھی ہے کہ آفتاب پرستوں کے اوقاتِ عبادت سے اجتناب کیا جائے۔ آفتاب ہر زمانے میں مشرکین کا سب سے بڑا یا بہت بڑا معبود رہا ہے اور اس کے طلوع و غروب کے اوقات خاص طور پر ان کے اوقاتِ عبادت رہے ہیں، اس لیے ان اوقات میں تو نماز پڑھنا حرام کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ آفتاب کی پرستش زیادہ تر اس کے عروج کے اوقات میں کی جاتی رہی ہے، لہٰذا اسلام میں حکم دیا گیا کہ تم دن کی نمازیں زوالِ آفتاب کے بعد پڑھنی شروع کرو اور صبح کی نماز طلوعِ آفتاب سے پہلے پڑھ لیا کرو۔ اس مصلحت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود متعدد احادیث میں بیان فرمایا ہے (بقیہ ص۳۴۹)

لہ وکلہ دیکھیں ص ۳۷۹-۳۸۰

اور دعا کر کہ پروردگار، مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں

(بقیہ حاشیہ ۲۶۷) چنانچہ ایک حدیث میں حضرت عمرو بن عَبَسہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے اوقات دریافت کیے تو آپ نے فرمایا:

صل صلوٰۃ الصبح ثم اقصر عن الصلوٰۃ حین تطلع الشمس حتی ترتفع فانھا تطلع حین تطلع بین قرنی الشیطان وحینئذٍ یسجد لھا الکفار	صبح کی نماز پڑھو اور جب سورج نکلنے لگے تو نماز سے رک جاؤ یہاں تک کہ سورج بلند ہو جائے۔ کیونکہ سورج جب نکلتا ہے تو شیطان کے سینگوں کے درمیان نکلتا ہے اور اس وقت کفار اس کو سجدہ کرتے ہیں۔

پھر آپ نے عصر کی نماز کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

ثم اقصر عن الصلوٰۃ حتی تغرب الشمس فانھا تغرب بین قرنی الشیطان وحینئذٍ یسجد لھا الکفار (رواہ مسلم)	پھر نماز سے رک جاؤ یہاں تک کہ سورج غروب ہو جائے کیونکہ سورج شیطان کے سینگوں کے درمیان غروب ہوتا ہے اور اس وقت کفار اس کو سجدہ کرتے ہیں۔

اس حدیث میں سورج کا شیطان کے سینگوں کے درمیان طلوع اور غروب ہونا ایک استعارہ ہے۔ یہ تصور دلانے کے لیے کہ شیطان اس کے نکلنے اور ڈوبنے کے اوقات کو لوگوں کے لیے ایک فتنۂ عظیم بنا دیتا ہے۔ گویا جب لوگ اس کو نکلتے اور ڈوبتے دیکھ کر سجدہ ریز ہوتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیطان اسے اپنے سر پر لیے ہوئے آیا ہے اور سر ہی پر لیے جا رہا ہے۔ اس استعارے کی گرہ حضورؐ نے خود اپنے اس فقرے میں کھول دی ہے کہ "اس وقت کفار اس کو سجدہ کرتے ہیں"۔

لہ (حاشیہ متعلقہ صفحہ ۲۷۸) تہجد کے معنی ہیں نیند توڑ کر اٹھنے کے۔ پس رات کے وقت تہجد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ رات کا ایک حصہ سونے کے بعد پھر اٹھ کر نماز پڑھی جائے۔

لہ (حاشیہ متعلقہ صفحہ ۲۷۸) نفل کے معنی ہیں فرض سے زائد۔ اس سے خود بخود یہ اشارہ نکل آیا کہ وہ پانچ نمازیں جن کے اوقات کا نظام پہلی آیت میں بیان کیا گیا تھا، فرض ہیں، اور یہ چھٹی نماز فرض سے زائد ہے۔

سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال،[۱] اور اپنی طرف سے اقتدار حکومت کو میرا مددگار بنا۔[۲]

(حاشیہ ۲ متعلقہ صفحہ ۴۸) یعنی دنیا اور آخرت میں تم کو ایسے مرتبے پر پہنچا دے جہاں تم محمود خلائق ہو کر رہو، ہر طرف سے تم پر مدح و ستائش کی بارش ہو، اور تمہاری ہستی ایک قابل تعریف ہستی بن کر رہے۔ آج تمہارے مخالفین تمہاری تواضع گالیوں اور ملامتوں سے کر رہے ہیں اور ملک بھر میں تم کو بدنام کرنے کے لیے انہوں نے جھوٹے الزامات کا ایک طوفان برپا کر رکھا ہے۔ مگر وہ وقت دور نہیں ہے جبکہ دنیا تمہاری تعریفوں سے گونج اٹھے گی اور آخرت میں بھی تم ساری خلق کے ممدوح ہو کر رہو گے۔ قیامت کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام شفاعت پر کھڑا ہونا بھی اسی مرتبہ محمودیت کا ایک حصہ ہے۔

[۱] اس دعا کی تلقین سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کا وقت اب بالکل قریب آ لگا تھا۔ اس لیے فرمایا کہ تمہاری دعا یہ ہونی چاہیے کہ صداقت کا دامن کسی حال میں تم سے نہ چھوٹے، جہاں سے بھی نکلو صداقت کی خاطر نکلو اور جہاں بھی جاؤ صداقت کے ساتھ جاؤ۔

[۲] یعنی یا تو مجھے خود حکومت دے یا کسی حکومت کو میرا مددگار بنا دے تاکہ اس کی طاقت سے میں دنیا کے اس بگاڑ کو درست کر سکوں، فواحش اور معاصی کے اس سیلاب کو روک سکوں، اور تیرے قانون عدل کو جاری کر سکوں۔ یہی تفسیر ہے اس آیت کی جو حسن بصری اور قتادہ نے کی ہے، اور اسی کو ابن جریر اور ابن کثیر جیسے جلیل القدر مفسرین نے اختیار کیا ہے، اور اسی کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث کرتی ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ لَیَزَعُ بِالسُّلْطَانِ مَا لَا یَزَعُ بِالْقُرْاٰنِ، یعنی "اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے اُن چیزوں کا سدباب کر دیتا ہے جن کا سدباب قرآن سے نہیں کرتا"۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام دنیا میں جو اصلاح چاہتا ہے وہ صرف وعظ و تذکیر سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کو عمل میں لانے کے لیے سیاسی طاقت بھی درکار ہے۔ پھر جبکہ یہ دعا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو خود سکھائی ہے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اقامت دین اور نفاذ شریعت اور اجرائے حدود اللہ کے لیے حکومت چاہنا اور اس کے حصول کی کوشش کرنا نہ صرف جائز بلکہ مطلوب و مندوب ہے اور وہ لوگ غلطی پر ہیں جو اسے دنیا پرستی یا دنیا طلبی سے تعبیر کرتے ہیں۔ دنیا پرستی اگر ہے تو یہ کہ کوئی شخص اپنے لیے حکومت کا طالب ہو۔ رہا خدا کے دین کے لیے حکومت کا طالب ہونا تو یہ دنیا پرستی نہیں بلکہ خدا پرستی ہی کا عین تقاضا ہے۔

اور اعلان کر دے کہ "حق آگیا اور باطل مٹ گیا، باطل تو مٹنے ہی والا ہے"۔
ہم اِس قرآن کے سلسلۂ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو ماننے والوں کے لیے تو شفا اور رحمت ہے، مگر ظالموں کے لیے خسارے کے سوا اور کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتا۔[2] انسان کا حال یہ ہے

[1] یہ اعلان اس وقت کیا گیا تھا جبکہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد مکہ چھوڑ کر حبش میں پناہ گزین تھی، اور باقی مسلمان سخت بیکسی و مظلومی کی حالت میں مکہ اور اطراف مکہ میں زندگی بسر کر رہے تھے اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہر وقت خطرے میں تھی۔ اس وقت بظاہر باطل ہی کا غلبہ تھا اور غلبۂ حق کے آثار کہیں دور دور نظر نہ آتے تھے۔ مگر اسی حالت میں نبی کو حکم دے دیا گیا کہ تم صاف صاف ان باطل پرستوں کو سنا دو کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔ ایسے وقت میں یہ عجیب اعلان لوگوں کو محض زبان کا پھاگ محسوس ہوا اور انہوں نے اسے ٹھٹھوں میں اڑا دیا۔ مگر اس پر نو برس ہی گذرے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی شہر مکہ میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور آپ نے کعبے میں جا کر اس باطل کو مٹا دیا جو تین سو ساٹھ بتوں کی صورت میں وہاں سجا رکھا تھا۔ بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود کا بیان ہے کہ فتح مکہ کے دن حضور کعبے کے بتوں پر ضرب لگا رہے تھے اور آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے کہ "جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا۔ جاء الحق وما یُبدئُ الباطل وما یُعید۔"

[2] یعنی جو لوگ اس قرآن کو اپنا رہنما اور اپنے لیے کتابِ آئین مان لیں ان کے لیے تو یہ خدا کی رحمت اور ان کے تمام ذہنی، نفسانی، اخلاقی اور تمدنی امراض کا علاج ہے، مگر جو ظالم اسے رد کر کے اور اس کی رہنمائی سے منہ موڑ کر اپنے اوپر آپ ظلم کریں ان کو یہ قرآن اُس حالت پر بھی نہیں رہنے دیتا جس پر وہ اس کے نزول سے یا اس کے جاننے سے پہلے تھے، بلکہ یہ انہیں اُلٹا اس سے زیادہ خسارے میں ڈال دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک قرآن آیا نہ تھا، یا جب تک وہ اس سے واقف نہ ہوئے تھے، ان کا خسارہ محض جہالت کا خسارہ تھا۔ مگر جب قرآن ان کے سامنے آگیا اور اس نے حق اور باطل کا فرق کھول کر رکھ دیا تو ان پر خدا کی حجت تمام ہوگئی۔ اب اگر وہ اسے رد کر کے گمراہی پر اصرار کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جاہل نہیں بلکہ ظالم اور باطل پرست اور حق سے نفور ہیں۔ اب ان کی حیثیت وہ ہے جو زہر اور تریاق، دونوں کو دیکھ کر (باقی حاشیہ ۲۹۲)

کہ جب ہم اس کو نعمت عطا کرتے ہیں تو وہ اینٹھتا اور پیٹھ موڑ لیتا ہے اور جب ذرا مصیبت سے دوچار ہوتا ہے تو مایوس ہونے لگتا ہے۔ اے نبی، ان لوگوں سے کہہ دے کہ "ہر ایک اپنے طریقے پر عمل کر رہا ہے، اب یہ تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ سیدھی راہ پر کون ہے"ع

یہ لوگ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کہو "یہ روح میرے رب کے حکم سے آتی ہے، مگر تم لوگوں نے علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے"؛ اور اے محمدؐ، ہم چاہیں تو وہ سب کچھ تم سے چھین لیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۱) زبر انتخاب کرنے والے کی ہوتی ہے۔ اب اپنی گمراہی کے وہ پورے ذمہ دار اور ہر گناہ جو اس کے بعد وہ کریں اس کی پوری سزا کے مستحق ہیں۔ یہ خسارہ جہالت کا نہیں بلکہ شرارت کا خسارہ ہے جسے جہالت کے خسارے سے بڑھ کر ہی ہونا چاہیے۔

ل عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہاں روح سے مراد جان ہے، یعنی لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روح حیات کے متعلق پوچھا تھا کہ اس کی حقیقت کیا ہے، اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ وہ اللہ کے حکم سے آتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ معنی تسلیم کرنے میں سخت تامل ہے، اس لیے کہ یہ معنی صرف اُس صورت میں لیے جاسکتے ہیں جبکہ سیاق و سباق کو نظر انداز کر دیا جائے اور سلسلۂ کلام سے بالکل الگ کر کے اس آیت کو ایک منفرد جملے کی حیثیت سے لے لیا جائے۔ ورنہ اگر سلسلۂ کلام میں رکھ کر دیکھا جائے تو روح کو جان کے معنی میں لینے کے بعد عبارت میں سخت بے ربطی محسوس ہوتی ہے اور اس امر کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ جہاں پہلے تین آیتوں میں قرآن کے نسخۂ شفا ہونے اور منکرینِ قرآن کے ظالم اور کافرِ نعمت ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، اور جہاں بعد کی آیتوں میں پھر قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے پر استدلال کیا گیا ہے، وہاں آخر کس مناسبت سے یہ مضمون آگیا کہ جانداروں میں جان خدا کے حکم سے آتی ہے؟

ربطِ عبارت کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں روح سے مراد "وحی" یا وحی لانے والا فرشتہ ہی ہو سکتا ہے۔ مشرکین کا سوال دراصل یہ تھا کہ یہ قرآن تم کہاں سے لاتے ہو؟ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمدؐ، تم سے یہ لوگ روح یعنی ماخذِ قرآن، یا ذریعۂ حصولِ قرآن کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ انہیں بتا دو کہ یہ روح میرے رب کے حکم سے آتی ہے، مگر تم لوگوں نے علم سے اتنا کم بہرہ پایا ہے کہ تم انسانی ربانی (۳۸۳) پر

جو ہم نے وحی کے ذریعہ سے تم کو عطا کیا ہے، پھر تم ہمارے مقابلے میں کوئی حمایتی نہ پاؤ گے جو اسے واپس دلا سکے۔ یہ تو جو کچھ تمہیں ملا ہے تمہارے رب کی رحمت سے ملا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس کا فضل تم پر بہت بڑا ہے[1]۔ کہدو کہ اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۲) ساخت کے کلام اور وحی ربانی کے ذریعہ سے نازل ہونے والے کلام کا فرق نہیں سمجھتے اور اس کلام پر یہ شبہ کرتے ہو کہ اسے کوئی انسان گھڑ رہا ہے۔

* تفسیر نہ صرف اس لحاظ سے قابلِ ترجیح ہے کہ تقریر ماسبق اور تقریر مابعد کے ساتھ آیت کا ربط اسی تفسیر کا متقاضی ہے، بلکہ خود قرآن مجید میں بھی دوسرے مقامات پر یہ مضمون قریب قریب انہی الفاظ میں بیان کیا گیا ہے چنانچہ سورہ مومن میں ارشاد ہوا ہے يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ لِيُنذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ۔ "وہ اپنے حکم سے اپنے جس بندے پر چاہتا ہے روح نازل کرتا ہے تاکہ وہ لوگوں کے اکٹھے ہونے کے دن سے آگاہ کر دے"۔ اور سورہ شوریٰ میں فرمایا وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ "اور اسی طرح ہم نے تیری طرف ایک روح اپنے حکم سے بھیجی۔ تو نہ جانتا تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہے"۔

سلف میں سے ابن عباس، قتادہ اور حسن بصری رحمہم اللہ نے بھی یہی تفسیر اختیار کی ہے۔ ابن جریر نے اس قول کو قتادہ کے حوالہ سے ابن عباس کی طرف منسوب کیا ہے، مگر یہ عجیب بات لکھی ہے کہ ابن عباس اس خیال کو چھپا کر بیان کرتے تھے۔ اور صاحب روح المعانی حسن اور قتادہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ "روح سے مراد جبرائیل ہیں اور سوال دراصل یہ تھا کہ وہ کیسے نازل ہوتے ہیں اور کس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر وحی کا القاء ہوتا ہے"۔

[1] خطاب بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، مگر مقصود دراصل کفار کو سنانا ہے جو قرآن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا گھڑا ہوا یا کسی انسان کا درپردہ سکھایا ہوا کلام کہتے تھے۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ یہ کلام پیغمبر نے نہیں گھڑا بلکہ ہم نے عطا کیا ہے اور اگر ہم اسے چھین لیں تو نہ پیغمبر کی یہ طاقت ہے کہ وہ ایسا کلام تصنیف کر کے لا سکے اور نہ کوئی دوسری طاقت ایسی ہے جو اس کو ایسی معجزانہ کتاب پیش کرنے کے قابل بنا سکے۔

کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لا سکیں گے، چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں[1]۔

[1] یہ چیلنج اس سے پہلے قرآن مجید میں تین مقامات پر گزر چکا ہے۔ سورۂ بقرہ (رکوع ۳)، سورۂ یونس (رکوع ۴) اور سورۂ ہود (رکوع ۲)۔ آگے سورۂ طور (رکوع ۲) میں بھی یہی مضمون آرہا ہے۔ ان سب مقامات پر یہ بات کفار کے اس الزام کے جواب میں ارشاد ہوئی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یہ قرآن تصنیف کر لیا ہے اور خواہ مخواہ وہ اسے خدا کا کلام بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ مزید برآں سورۂ یونس (رکوع ۲) میں اسی الزام کی تردید کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا گیا کہ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَیْكُمْ وَلَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ یعنی اے محمد، ان سے کہو کہ اگر اللہ نے یہ نہ چاہا ہوتا کہ میں یہ قرآن تمہیں سناؤں تو میں ہرگز نہ سنا سکتا تھا بلکہ تمہیں اس کی خبر بھی نہ دے سکتا تھا۔ آخر میں تمہارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہوں، کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے؟

اس طرح ان آیات میں قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی تین دلیلیں پیش کی گئی ہیں:-

ایک یہ کہ یہ قرآن اپنی زبان، اسلوب بیان، طرز استدلال، مضامین، مباحث، تعلیمات اور اخبار غیب کے لحاظ سے ایسی بے مثل کتاب ہے کہ ایک انسان تو درکنار، تمام انسان مل کر بھی اس طرح کی کتاب تصنیف نہیں کر سکتے۔ بلکہ اگر وہ جن بھی، جنہیں مشرکین نے اپنا معبود بنا رکھا ہے، اور جن کی معبودیت پر یہ کتاب علانیہ ضرب لگا رہی ہے، منکرین قرآن کی مدد پر اکٹھے ہو جائیں تو وہ ان کو اس قابل نہیں بنا سکتے کہ قرآن کے پائے کی کتاب تصنیف کر کے اس چیلنج کو رد کر سکیں۔

دوسرے یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہیں باہر سے یکایک تمہارے درمیان نمودار نہیں ہو گئے ہیں، بلکہ اس قرآن کے نزول سے پہلے بھی ۴۰ سال تمہارے درمیان رہ چکے ہیں۔ کیا دعوائے نبوت سے ایک دن پہلے بھی کبھی تم نے ان کی زبان سے اس طرز کا کلام، اور ان مسائل اور مضامین پر مشتمل کلام سنا تھا؟ اگر نہیں سنا تھا اور یقیناً نہیں سنا تھا تو کیا یہ بات تمہاری سمجھ میں آتی ہے کہ کسی شخص کی زبان، خیالات، معلومات اور طرز فکر و بیان میں یکایک ایسا تغیر واقع ہو سکتا ہے؟

تیسرے یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں قرآن سنا کر کہیں غائب نہیں ہو جاتے بلکہ تمہارے (باقی ص ۳۶۵ پر)

ہم نے اِس قرآن میں لوگوں کو طرح طرح سے سمجھایا مگر اکثر لوگ انکار ہی پر جمے رہے۔ اور انہوں نے کہا "ہم تیری بات نہ مانیں گے جب تک کہ تو ہمارے لیے زمین کو پھاڑ کر ایک چشمہ جاری نہ کر دے۔ یا تیرے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور تو اُس میں نہریں رواں کر دے۔ یا تو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرا دے جیسا کہ تیرا دعویٰ ہے۔ یا خدا اور فرشتوں کو رُو در رُو ہمارے سامنے لے آئے۔ یا تیرے لیے سونے کا ایک گھر بن جائے۔ یا تو آسمان پر چڑھ جائے۔ اور تیرے چڑھنے کا بھی ہم یقین نہ کریں گے جب تک کہ تو ہمارے اُوپر ایک ایسی تحریر نہ اُتار لائے جسے ہم پڑھیں"۔ —— اے محمدؐ، ان سے کہو، "پاک ہے میرا پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟"[۱] ع

(بقیہ حاشیہ ۳۸۵) درمیان ہی رہتے سہتے ہیں۔ تم اُن کی زبان سے قرآن بھی سنتے ہو اور دوسری گفتگوئیں اور تقریریں بھی سنا کرتے ہو۔ قرآن کے کلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے کلام میں زبان اور اسلوب کا اتنا نمایاں فرق ہے کہ کسی ایک انسان کے دو اِس قدر مختلف اسٹائل کبھی ہو نہیں سکتے۔ یہ فرق صرف اُسی زمانہ میں واضح نہیں تھا جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ملک کے لوگوں میں رہتے سہتے تھے۔ بلکہ آج بھی حدیث کی کتابوں میں آپ کے سینکڑوں اقوال اور خطبے موجود ہیں۔ ان کی زبان اور اسلوب قرآن کی زبان اور اسلوب سے اس قدر مختلف ہیں کہ زبان و ادب کا کوئی رمز آشنا نقاد یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے کلام ہو سکتے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورۂ یونس آیت ۱۶ کا حاشیہ)

[۱] معجزات کے مطالبے کا ایک جواب اس سے پہلے رکوع ۶ کی آیت وَمَا مَنَعَنَآ اَنۡ نُّرۡسِلَ بِالۡاٰيٰتِ میں گزر چکا ہے۔ اب یہاں اسی مطالبے کا دوسرا جواب دیا گیا ہے۔ اِس مختصر سے جواب کی بلاغت تعریف سے بالاتر ہے۔ مخالفین کا مطالبہ یہ تھا کہ اگر تم پیغمبر ہو تو ابھی زمین کی طرف ایک اشارہ کرو اور یکایک ایک چشمہ پھوٹ بہے، یا فوراً ایک لہلہاتا باغ پیدا ہو جائے اور اس میں نہریں جاری ہو جائیں۔ آسمان کی طرف اشارہ کرو اور تمہارے جھٹلانے والوں پر آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر جائے۔ ایک پھونک مارو اور چشم زدن میں سونے کا ایک محل بن کر تیار ہو جائے۔ ایک آواز دو اور ہمارے سامنے خدا اور اس کے فرشتے فوراً آ کھڑے ہوں اور (باقی ۳۸۶ پر)

لوگوں کے سامنے جب کبھی ہدایت آئی تو اس پر ایمان لانے سے اُن کو کسی چیز نے نہیں روکا مگر اُن کے اِسی قول نے کہ "کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا؟"[1] اِن سے کہو اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ضرور کسی فرشتے ہی کو اُن کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجتے۔[2]

(بقیہ حاشیہ ص ۲۸۵) وہ شہادت دیں کہ ہم ہی نے محمد کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے آسمان پر چڑھ کر جاؤ اور اللہ میاں سے ایک خط ہمارے نام لکھوا لاؤ جسے ہم ہاتھ سے چھوئیں اور آنکھوں سے پڑھیں ــــــ اِن لمبے چوڑے مطالبوں کا بس یہ جواب دے کر چھوڑ دیا گیا کہ "اِن سے کہو، پاک ہے میرا پروردگار! کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں؟" یعنی بیوقوفو! کیا میں نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا تھا کہ تم یہ مطالبے مجھ سے کرنے لگے؟ میں نے تم سے کب کہا تھا کہ میں قادرِ مطلق ہوں؟ میں نے کب کہا تھا کہ زمین و آسمان پر میری حکومت چل رہی ہے؟ میرا دعویٰ تو اول روز سے یہی تھا کہ میں خدا کی طرف سے پیغام لانے والا ایک انسان ہوں۔ تمہیں جانچنا ہے تو میرے پیغام کو جانچو۔ ایمان لانا ہے تو اس پیغام کی صداقت و معقولیت دیکھ کر ایمان لاؤ۔ انکار کرنا ہے تو اس پیغام میں کوئی نقص نکال کر دکھاؤ۔ میری صداقت کا اطمینان کرنا ہے تو ایک انسان ہونے کی حیثیت سے میری زندگی کو، میرے اخلاق کو، میرے کام کو دیکھو۔ یہ سب کچھ چھوڑ کر تم مجھ سے یہ کیا مطالبہ کرنے لگے کہ زمین پھاڑو اور آسمان گراؤ؟ آخر پیغمبری کا ان کاموں سے کیا تعلق ہے؟

[1] یعنی ہر زمانے کے جاہل لوگ اسی غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ بشر کبھی پیغمبر نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے جب کوئی رسول آیا تو انہوں نے یہ دیکھ کر کہ کھاتا ہے، پیتا ہے، بیوی بچے رکھتا ہے، گوشت پوست کا بنا ہوا ہے، فیصلہ کر دیا کہ یہ پیغمبر نہیں ہے، کیونکہ بشر ہے۔ اور جب وہ گزر گیا تو ایک مدت کے بعد اس کے عقیدت مندوں میں ایسے لوگ پیدا ہونے شروع ہو گئے جو کہنے لگے کہ وہ بشر نہیں تھا، کیونکہ پیغمبر تھا۔ چنانچہ کسی نے اس کو خدا بنایا، کسی نے اسے خدا کا بیٹا کہا، اور کسی نے کہا کہ خدا اس میں حلول کر گیا تھا۔ غرض بشریت اور پیغمبری کا ایک ذات میں جمع ہونا جاہلوں کے لیے ہمیشہ ایک معمّا ہی بنا رہا۔

[2] یعنی پیغمبر کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ آ کر پیغام سنا دیا کرے، بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ اس پیغام کے مطابق انسانی زندگی کی اصلاح کرے۔ اسے انسانی احوال پر اس پیغام کے اصولوں کا انطباق (باقی ص ۲۸۷ پر)

اے محمدؐ، ان سے کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان بس ایک اللہ کی گواہی کافی ہے۔ وہ اپنے بندوں کے حال سے باخبر ہے اور سب کچھ دیکھ رہا ہے۔[1]

جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے، اور جسے وہ گمراہی میں ڈال دے تو اس کے بعد ایسے لوگوں کے لیے تو کوئی حامی و ناصر نہیں پا سکتا۔[2] ان لوگوں کو ہم قیامت کے روز اوندھے منہ کھینچ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶) کرنا ہوتا ہے۔ اسے خود اپنی زندگی میں ان اصولوں کا عملی مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ اسے اُن بے شمار مختلف انسانوں کے ذہن کی گتھیاں سلجھانی پڑتی ہیں جو اس کا پیغام سننے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسے ماننے والوں کی تنظیم اور تربیت کرنی ہوتی ہے تاکہ اس پیغام کی تعلیمات کے مطابق ایک معاشرہ وجود میں آئے۔ اسے انکار اور مخالفت و مزاحمت کرنے والوں کے مقابلے میں جدوجہد کرنی ہوتی ہے تاکہ بگاڑ کی حمایت کرنے والی طاقتوں کو نیچا دکھایا جائے اور وہ اصلاح عمل میں آسکے جس کے لیے خدا نے اپنا پیغمبر مبعوث فرمایا ہے۔ یہ سارے کام جبکہ انسانوں ہی میں کرنے کے ہیں تو ان کے لیے انسان نہیں تو اور کون بھیجا جاتا؟ فرشتہ تو زیادہ سے زیادہ بس یہی کرتا کہ آتا اور پیغام پہنچا کر چلا جاتا۔ انسانوں میں انسان کی طرح رہ کر انسان کے سے کام کرنا اور پھر انسانی زندگی میں منشائے الٰہی کے مطابق اصلاح کر کے دکھا دینا کسی فرشتے کے بس کا کام نہ تھا۔ اس کے لیے تو ایک انسان ہی موزوں ہو سکتا تھا۔

[1] یعنی جس جس طرح سے میں تمہیں سمجھا رہا ہوں اور تمہاری اصلاح حال کے لیے کوشش کر رہا ہوں اسے بھی اللہ جانتا ہے، اور جو جو کچھ تم میری مخالفت میں کر رہے ہو اس کو بھی اللہ دیکھ رہا ہے۔ فیصلہ آخر کار اسی کو کرنا ہے، اس لیے بس اسی کا جاننا اور دیکھنا کافی ہے۔

[2] یعنی جس کی ضلالت پسندی اور ہٹ دھرمی کے سبب سے اللہ نے اس پر ہدایت کے دروازے بند کر دیے ہوں اور جسے اللہ ہی نے اُن گمراہیوں کی طرف دھکیل دیا ہو جن کی طرف وہ جانا چاہتا تھا، تو اب اور کون ہے جو اس کو راہِ راست پر لا سکے؟ جس شخص نے سچائی سے منہ موڑ کر جھوٹ پر مطمئن ہونا چاہا، اور جس کی اس خباثت کو دیکھ کر اللہ نے بھی اس کے لیے وہ اسباب فراہم کر دیئے جن سے سچائی کے خلاف اُس کی نفرت میں اور جھوٹ پر اُس کے اطمینان میں اور زیادہ اضافہ ہوتا چلا جائے، اسے آخر دنیا کی کونسی طاقت جھوٹ سے منحرف اور (باقی صفحہ ۲۸ پر)

لائیں گے، اندھے، گونگے اور بہرے[1] - اِن کا ٹھکانا جہنم ہے - جب کبھی اس کی آگ دھیمی ہونے لگے گی ہم اسے اور بھڑکا دینگے - یہ بدلہ ہے ان کی اِس حرکت کا کہ انہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور کہا "کیا جب ہم صرف ہڈیاں اور خاک ہو کر رہ جائیں گے تو نئے سرے سے ہم کو پیدا کر کے اٹھا کھڑا کیا جائیگا؟" کیا ان کو یہ نہ سُوجھا کہ جس خدا نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے وہ اِن جیسوں کو پیدا کرنے کی ضرور قدرت رکھتا ہے؟ اس نے اِن کے حشر کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے جس کا آنا یقینی ہے، مگر ظالموں کو اصرار ہے کہ وہ اس کا انکار ہی کریں گے۔

اَے محمدؐ، اِن سے کہو، اگر کہیں میرے رب کی رحمت کے خزانے تمہارے قبضے میں ہوتے تو تم خرچ ہو جانے کے اندیشے سے ضرور ان کو روک رکھتے واقعی انسان بڑا تنگ دل واقع ہُوا ہے[2]۔

ہم نے موسیٰ کو ۹ نشانیاں عطا کی تھیں جو صریح طور پر دکھائی دے رہی تھیں[3]۔ اب یہ تم خود

(بقیہ حاشیہ ۲۸۷) سچائی پر مطمئن کر سکتی ہے؟ اللہ کا یہ قاعدہ نہیں کہ جو خود بھٹکنا چاہے اسے زبردستی ہدایت دے، اور کسی دوسری ہستی میں یہ طاقت نہیں کہ لوگوں کے دل بدل دے۔

[1] یعنی جیسے وہ دنیا میں بن کر رہے کہ نہ حق دیکھتے تھے، نہ حق سنتے تھے اور نہ حق بولتے تھے، ویسے ہی وہ قیامت میں اٹھائے جائیں گے۔

[2] یہ اشارہ اُسی مضمون کی طرف ہے جو اِس سے پہلے رکوع ۶ کی آیت وربك اعلم بمن فی السمٰوٰت والارض میں گزر چکا ہے۔ مشرکین مکہ جن نفسیاتی وجوہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرتے تھے ان میں سے ایک اہم وجہ یہ تھی کہ اِس طرح انہیں آپ کا فضل و شرف ماننا پڑتا تھا، اور اپنے کسی معاصر اور ہم چشم کا فضل ماننے کے لیے انسان مشکل ہی سے آمادہ ہُوا کرتا ہے۔ اسی پر فرمایا جا رہا ہے کہ جن لوگوں کی بخیلی کا حال یہ ہے کہ کسی کے واقعی مرتبے کا اقرار و اعتراف کرتے ہوئے بھی ان کا دل دکھتا ہے، انہیں اگر کہیں خدا نے اپنے خزانہائے رحمت کی کنجیاں حوالے کر دی ہوتیں تو وہ کسی کو پھوٹی کوڑی بھی نہ دیتے۔

[3] واضح رہے کہ یہاں پھر کفارِ مکہ کو معجزات کے مطالبے کا جواب دیا گیا ہے، اور یہ تیسرا جواب ہے۔ کفار کہتے تھے کہ ہم تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک تم یہ اور یہ کام کر کے نہ دکھاؤ۔ جواب میں ان سے (باقی ۲۸۹ پر)

بنی اسرائیل سے پوچھ لو کہ جب وہ سامنے آئیں تو فرعون نے یہی کہا تھا نا کہ "اَے موسیٰ، میں سمجھتا ہوں کہ تو ضرور ایک سحرزدہ آدمی ہے[۱۰۳]۔" موسیٰ نے اس کے جواب میں کہا "تو خوب جانتا ہے کہ یہ بصیرت افروز

(بقیہ حاشیہ ص ۳۸۵) کہا جارہا ہے کہ تم سے پہلے فرعون کو ایسے ہی صریح معجزات، ایک دو نہیں، پے در پے ۹ دکھائے گئے تھے، پھر تمہیں معلوم ہے کہ جو نہ ماننا چاہتا تھا اس نے انہیں دیکھ کر کیا کہا؟ اور یہ بھی خبر ہے کہ جب اس نے معجزات دیکھ کر بھی نبی کو جھٹلایا تو اس کا کیا انجام ہوا؟

وہ نو نشانیاں جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، اس سے پہلے سورۂ اعراف میں گزر چکی ہیں یعنی عصا، جو اژدہا بن جاتا تھا، یدِ بیضاء جو بغل سے نکالتے ہی سورج کی طرح چمکنے لگتا تھا، جادوگروں کے جادو کو برسرِ عام شکست دینا، ایک اعلان کے مطابق سارے ملک میں قحط برپا ہو جانا، اور پھر یکے بعد دیگرے طوفان، ٹڈی دل، سُرسریوں، مینڈکوں اور خون کی بلاؤں کا نازل ہونا۔

یہ وہی خطاب ہے جو مشرکینِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے۔ اسی سورت کے رکوع ۵ میں ان کا یہ قول گزر چکا ہے کہ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (تم تو ایک سحرزدہ آدمی کے پیچھے چلے جارہے ہو)۔ اب ان کو بتایا جارہا ہے کہ ٹھیک اسی خطاب سے فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو نوازا تھا۔

اس مقام پر ایک ضمنی مسئلہ اور بھی ہے جس کی طرف ہم اشارہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ زمانۂ حال میں منکرینِ حدیث نے احادیث پر جو اعتراضات کیے ہیں ان میں سے ایک اعتراض یہ ہے کہ حدیث کی رو سے ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا اثر ہو گیا تھا، حالانکہ قرآن کی رو سے کفار کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ جھوٹا الزام تھا کہ آپ ایک سحرزدہ آدمی ہیں۔ منکرینِ حدیث کہتے ہیں کہ اس طرح راویانِ حدیث نے قرآن کی تکذیب اور کفار کی تصدیق کی ہے۔ لیکن یہاں دیکھیے کہ بعینہٖ قرآن کی رو سے حضرت موسیٰ پر بھی فرعون کا یہ جھوٹا الزام تھا کہ آپ ایک سحرزدہ آدمی ہیں، اور پھر قرآن خود ہی سورۂ طٰہٰ میں کہتا ہے کہ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى یعنی جب جادوگروں نے اپنے اَنچھر پھینکے تو یکایک ان کے جادو سے موسیٰ کو یہ محسوس ہونے لگا کہ ان کی لاٹھیاں اور رسیاں دوڑ رہی ہیں، پس موسیٰ اپنے دل میں ڈر سا گیا۔" کیا یہ الفاظ صریح طور پر دلالت نہیں کر رہے ہیں کہ حضرت موسیٰ اس وقت جادو (باقی ص ۳۹۰ پر)

نشانیاں رب السموات والارض کے سوا کسی نے نازل نہیں کی ہیں[1]، اور میرا خیال یہ ہے کہ ایسے

البقیہ حاشیہ ۲۸۹) سے متاثر ہو گئے تھے؟ اور کیا اس کے متعلق بھی منکرین حدیث یہ کہنے کے لیے تیار ہیں کہ یہاں قرآن نے خود اپنی تکذیب اور فرعون کے جھوٹے الزام کی تصدیق کی ہے؟

دراصل اس طرح کے اعتراضات اٹھانے والوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ کفار مکہ اور فرعون کس معنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ کو "مسحور" کہتے تھے۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ کسی دشمن نے جادو کر کے ان کو دیوانہ بنا دیا ہے اور اسی دیوانگی کے زیر اثر یہ نبوت کا دعویٰ کرتے اور ایک نرالا پیغام سناتے ہیں۔ قرآن ان کے اسی الزام کو جھوٹا قرار دیتا ہے۔ رہا وقتی طور پر کسی شخص کے جسم یا کسی حاسۂ جسم کا جادو سے متاثر ہو جانا تو یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کو پتھر مارنے سے چوٹ لگ جائے۔ اس چیز کا نہ کفار نے الزام لگایا تھا، نہ قرآن نے اس کی تردید کی، اور نہ اس طرح کے کسی وقتی تاثر سے نبی کے منصب پر کوئی حرف آتا ہے۔ نبی پر اگر زہر کا اثر ہو سکتا تھا، نبی اگر زخمی ہو سکتا تھا، تو اس پر جادو کا اثر بھی ہو سکتا تھا۔ اس سے منصب نبوت پر حرف آنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ منصب نبوت میں اگر قادح ہو سکتی ہے تو یہ بات کہ نبی کے قوائے عقلی و ذہنی جادو سے مغلوب ہو جائیں، حتیٰ کہ اس کا کام اور کلام سب جادو ہی کے زیر اثر ہونے لگے۔ مخالفین حق حضرت موسیٰ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہی الزام لگاتے تھے اور اسی کی تردید قرآن نے کی ہے۔

[1] یہ بات حضرت موسیٰ نے اس لیے فرمائی کہ کسی ملک پر قحط آ جانا، یا لاکھوں مربع میل زمین پر پھیلے ہوئے علاقے میں مینڈکوں کا ایک بلا کی طرح نکلنا، یا تمام ملک کے غلے کے گوداموں میں گھن لگ جانا، اور ایسے ہی دوسرے عام مصائب کسی جادوگر کے جادو، یا کسی انسانی طاقت کے کرتب سے رونما نہیں ہو سکتے۔ پھر جبکہ ہر بلا کے نزول سے پہلے حضرت موسیٰ فرعون کو نوٹس دے دیتے تھے کہ اگر تو اپنی ہٹ سے باز نہ آیا تو یہ بلا تیری سلطنت پر مسلط کی جائے گی، اور ٹھیک ان کے بیان کے مطابق وہی بلا پوری سلطنت پر نازل ہو جاتی تھی، تو اس صورت میں صرف ایک دیوانہ یا ایک سخت ہٹ دھرم آدمی ہی یہ کہہ سکتا تھا کہ ان بلاؤں کا نزول رب السموات والارض کے سوا کسی اور کی کارستانی کا نتیجہ ہے۔

فرعون، تو ضرور ایک شامت زدہ آدمی ہے۱؎" آخر کار فرعون نے ارادہ کیا کہ موسیٰ اور بنی اسرائیل کو زمین سے اکھاڑ پھینکے، مگر ہم نے اُس کو اور اس کے ساتھیوں کو اکٹھا غرق کر دیا اور اس کے بعد بنی اسرائیل سے کہا کہ اب تم زمین میں بسو۲؎، پھر جب آخرت کے وعدے کا وقت آن پورا ہو گا تو ہم تم سب کو ایک ساتھ لا حاضر کریں گے۔

اس قرآن کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور حق ہی کے ساتھ یہ نازل ہُوا ہے، اور تمہیں ہم نے اس کے سوا اور کسی کام کے لیے نہیں بھیجا کہ (جو مان لے اسے) بشارت دے دو اور (جو نہ مانے اُسے) متنبہ کر دو۳؎۔ اور اس قرآن کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا ہے تاکہ تم ٹھیر ٹھیر کر اسے لوگوں کو سناؤ، اور اسے ہم نے (موقع موقع سے) بتدریج اُتارا ہے۴؎۔ اے محمدؐ، ان لوگوں سے کہدو کہ تم اسے مانو یا نہ مانو، جن لوگوں کو اس

۱؎ یعنی میں تو سحر زدہ نہیں ہوں مگر تو ضرور شامت زدہ ہے۔ تیرا ان خدائی نشانیوں کو پے در پے دیکھنے کے بعد بھی اپنی ہٹ پر قائم رہنا صاف بتا رہا ہے کہ تیری شامت آگئی ہے۔

۲؎ یہ ہے اصل غرض اس قصے کو بیان کرنے کی۔ مشرکین مکہ اس فکر میں تھے کہ مسلمانوں کو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سرزمین عرب سے ناپید کر دیں۔ اس پر انہیں یہ سنایا جا رہا ہے کہ یہی کچھ فرعون نے موسیٰ اور بنی اسرائیل کے ساتھ کرنا چاہا تھا، مگر ہُوا یہ کہ فرعون اور اس کے ساتھی ناپید کر دیے گئے اور زمین پر موسیٰ اور پیروانِ موسیٰ ہی بسائے گئے۔ اب اگر اسی روش پر تم چلو گے تو تمہارا انجام اس سے کچھ بھی مختلف نہ ہو گا۔

۳؎ یعنی تمہارے ذمے یہ کام نہیں کیا گیا ہے کہ جو لوگ قرآن کی تعلیمات کو جانچ کر حق اور باطل کا فیصلہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں ان کو تم چشمے نکال کر اور باغ لگا کر اور آسمان پھاڑ کر کسی نہ کسی طرح مومن بنانے کی کوشش کرو، بلکہ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے حق بات پیش کر دو اور پھر انہیں صاف صاف بتا دو کہ جو اسے مانے گا وہ اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو نہ مانے گا وہ بُرا انجام دیکھے گا۔

۴؎ یہ مخالفین کے اس شبہ کا جواب ہے کہ اللہ میاں کو پیغام بھیجنا تھا تو پورا پیغام بیک وقت کیوں نہ بھیج دیا؟ یہ آخر ٹھیر ٹھیر کر تھوڑا تھوڑا پیغام کیوں بھیجا جا رہا ہے؟ کیا خدا کو بھی انسانوں کی طرح سوچ سوچ کر بات کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے؟ اس شبہ کا مفصل جواب سورۂ نحل (رکوع ۱۴) کی ابتدائی آیتوں میں گزر چکا ہے اور وہاں ہم اس کی تشریح بھی کر چکے ہیں، اس لیے یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔

سے پہلے علم دیا گیا ہے[1] انہیں جب یہ سنایا جاتا ہے تو وہ منہ کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں پاک ہے ہمارا رب، اس کا وعدہ تو پورا ہونا ہی تھا[2]۔" اور وہ منہ کے بل روتے ہوئے گر جاتے ہیں اور اسے سن کر ان کا خشوع اور بڑھ جاتا ہے[3]۔

اے نبی، ان سے کہو، اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو اس کے لیے سب اچھے ہی نام ہیں[4]۔ اور اپنی نماز نہ بہت زیادہ بلند آواز سے پڑھو اور نہ بہت پست آواز سے، ان دونوں کے درمیان اوسط درجے کا لہجہ اختیار کرو[5]۔ اور کہو "تعریف ہے اُس خدا کے لیے جس نے نہ کسی کو بیٹا بنایا، نہ کوئی بادشاہی میں اس کا شریک ہے اور نہ وہ عاجز ہے کہ کوئی اس کا پشتیبان ہو[6]۔" اور اس کی بڑائی بیان کرو، کمال درجے کی بڑائی ع

---

[1] یعنی وہ اہلِ کتاب جو آسمانی کتابوں کی تعلیمات سے واقف ہیں اور ان کے اندازِ کلام کو پہچانتے ہیں۔

[2] یعنی قرآن کو سن کر وہ فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ جس نبی کے آنے کا وعدہ پچھلے انبیاء کے صحیفوں میں کیا گیا تھا وہ آگیا ہے۔

[3] صالحینِ اہلِ کتاب کے اس رویے کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے۔ مثلاً آل عمران رکوع ۱۲، ۲۰۔ اور المائدہ رکوع ۱۱۔

[4] یہ جواب ہے مشرکین کے اس اعتراض کا کہ خالق کے لیے "اللہ" کا نام تو ہم نے سنا تھا، مگر یہ "رحمان" کا نام تم نے کہاں سے نکالا؟ اُن کے ہاں چونکہ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ نام رائج نہ تھا اس لیے وہ اس پر ناک بھوں چڑھاتے تھے۔

[5] ابنِ عباس کا بیان ہے کہ مکے میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا دوسرے صحابہ نماز پڑھتے وقت بلند آواز سے قرآن پڑھتے تھے تو کفار شور مچانے لگتے اور بسا اوقات گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دیتے تھے۔ اس پر حکم ہوا کہ نہ تو اتنے زور سے پڑھو کہ کفار سن کر ہجوم کریں، اور نہ اس قدر آہستہ پڑھو کہ تمہارے اپنے ساتھی بھی نہ سن سکیں۔ یہ حکم صرف انہی حالات کے لیے تھا۔ مدینے میں جب حالات بدل گئے تو یہ حکم باقی نہ رہا۔ البتہ جب کبھی مسلمانوں کو مکے کے سے حالات سے دوچار ہونا پڑے، انہیں اسی ہدایت کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔

[6] اس فقرے میں ایک لطیف طنز ہے اُن مشرکین کے عقائد پر جو مختلف دیوتاؤں اور بزرگ انسانوں کے بارے میں یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ میاں نے اپنی خدائی کے مختلف شعبے یا اپنی سلطنت کے مختلف علاقے ان کے انتظام میں دے رکھے ہیں۔ اس بیہودہ عقیدے کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اپنی خدائی کا بار سنبھالنے سے عاجز ہے اس لیے وہ اپنے پشتیبان تلاش کر رہا ہے۔ اسی بنا پر فرمایا گیا کہ اللہ عاجز نہیں ہے کہ اسے کچھ ڈپٹیوں اور مددگاروں کی حاجت ہو۔

نظامِ اسلامی اور اطاعتِ رسُول

(حدیث کا مقام نظامِ شریعت میں)

نعیم صدیقی

(۲)

رسول کو محض "قاصد" قرار دینے کا مغالطہ اوپر کی سطور میں نظامِ دینی کے اندر "الکتاب" کے ساتھ الرسول کے منصب کی جو اہمیت بیان کی گئی ہے، کچھ لوگ اس پر چھاپہ مارنے کے لیے ایک نہایت غلط اور گمراہ کن استدلال سے کام لیتے ہیں۔ وہ قرآن مجید میں سے نکال نکال کر دکھاتے ہیں کہ رسول کے بارے میں تو یہاں یہ وارد ہے کہ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغ (المائدہ)، اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلَاغ (الشوریٰ)، یعنی اللہ تعالیٰ نے خود رسول کی پوزیشن مشخص کر دی کہ اس کا منصب خدا کی بات (کتاب) جوں کی توں پہنچا دینے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

فی الواقع اگر قرآن کے ان کلمات کا مدعا یہی تھا جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں تو رسول کی حیثیت ایک مقدس خدائی ہرکارے سے زیادہ کچھ نہ ہوتی۔ پھر اسے "اطیعون" کہنے کا حق بھی نہ ہونا چاہیے تھا۔ پھر اسے یہ تکلیف اٹھانے کی ضرورت بھی نہ تھی کہ قرآن سننے والوں یا پڑھنے والوں کو اس کے سمجھنے میں جو مشکلات پیش آئیں انہیں رفع کرے۔ پھر اسے اس امر کا بھی مجاز نہ ہونا چاہیے تھا کہ قرآن کی تشریح و توضیح کرے، بلکہ یہ ہر شخص کا اپنا کام تھا کہ قرآن کو خود جس طرح چاہے سمجھتا رہے۔ پھر اس رسول (محض چٹھی رساں) کے "اسوۂ حسنہ" ہونے کی بھی کوئی وجہ نہ تھی۔ پھر تو اسے کسی ادب و احترام اور تعظیم کا مستحق بھی نہ ہونا چاہیے تھا، کجا کہ اس کی بیویاں تک مومنوں کی مائیں قرار پاتیں۔

بس زیادہ سے زیادہ اس کا مقام "انسانی جبریل" کا ہوتا کہ جو کچھ پارۂ الہام القا ہوا وہ جوں کا توں

پہنچا دیا اور پھر الگ ہو گئے۔ اب سامعین کا یہ اپنا کام ہے کہ وہ اس پارۂ الہام سے استفادہ کرتے ہیں یا اس کے ساتھ کچھ دوسرا سلوک کرتے ہیں۔ انسانی جبریل کو بیچ میں مداخلت کرنے کا منصب حاصل نہیں۔ وہ ہرکارے کی ڈیوٹی انجام دینے کے بعد فارغ ہے کہ اپنے گھر بار کے دوسرے کام دیکھے۔

اب ان مفسرینِ قرآن سے کوئی پوچھے کہ اگر واقعی رسول کا منصب خدا کی طرف سے صرف "بلاغ" کا منصب تھا تو پھر ایسا کیوں ہوا کہ وہ رسول کتاب الٰہی کی تلاوت کرنے کے علاوہ کتاب کی تعلیم دینے اور اس کے مطابق حکمت سکھانے کا منصب سنبھالتا ہے؟ وہ بات کو سیدھے سیدھے طریق سے ایک قاصد کی طرح پہنچا دینے کے بجائے کیوں اپنے جذبات کا بھی موقع بہ موقع مظاہرہ کرتا ہے؟ وہ لوگوں کے سوالات کے جواب قرآن کے الفاظ کے بجائے اپنے الفاظ میں کیوں دیتا ہے؟ وہ قرآن کی آیات کی شرح کیوں بیان کرتا ہے؟ وہ اپنی طرف سے بعض موقعوں پر تاریخی نظائر اور مثالوں سے کیوں کام لیتا ہے؟ وہ قرآن پڑھ دینے سے آگے بڑھ کر دعوت کے لئے جدوجہد اور کشمکش اور مقابلہ کیوں کرتا ہے؟ وہ دعوت ماننے والوں کی تنظیم کا کام ایک لیڈر بن کر کیوں سرانجام دیتا ہے؟ وہ مربی بن کر ان کی تربیت کیوں کرتا ہے؟ وہ مزکی بن کر ان کا تزکیہ کرنے کا منصب کیوں سنبھال لیتا ہے؟ وہ میدانِ جنگ میں سپہ سالار بن کر کیوں کھڑا ہو جاتا ہے؟ وہ ایک ریاست قائم کر کے اس کا حاکم اعلیٰ کیوں بن بیٹھتا ہے؟ وہ عدالت قائم کر کے اس کا جج کیوں بن جاتا ہے؟ آخر ایک "پوسٹ مین" کو ان خدمات سے کیا واسطہ؟ اس کا کام تو بادشاہ کا فرمان پہنچا دینے کے بعد ختم ہو جانا چاہیے تھا!

جس قرآن میں آپ نے یہ دیکھا کہ "وَمَا عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغ"، کیا اسی قرآن میں آپ کو یہ نظر نہ آیا کہ رسول ایک نمونۂ عمل بھی ہے، معلّم بھی ہے، مربی اور مزکی بھی ہے، لیڈر بھی ہے، حکمران بھی ہے، سپہ سالار بھی ہے، قاضی بھی ہے اور مجتہد بھی؟ پھر آپ نے کیوں نہ سوچا کہ آیا قرآن نے تضاد بیانی سے کام لیا ہے یا خود آپ قرآن کا مطلب سمجھنے میں ٹھوکر کھا گئے ہیں؟

آپ نے وَمَا عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغ اور اس معنی کی آیات کی جو تفسیر کی ہے اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ جب کوئی شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی کسی آیت کا مطلب اور اس کے عملی تقاضے دریافت کرتا تو آپ فرماتے کہ میرے ذمے تو صرف بلاغ کی ڈیوٹی ہے، آگے میرا کچھ منصب نہیں ہے۔ لوگ! ایمان لا کر

آپ کے گرد جمع ہونے لگتے تو آپ اُن کو متنبہ کر دیتے کہ بلاغ پر میرا کام ختم ہو گیا، اب آپ کی تنظیم کرنا میرا کام نہیں۔ ریاست بنانے، عدالتیں قائم کرنے اور جنگ لڑنے کے مواقع پیدا ہوتے تو آپ معذرت کر دیتے کہ بس بلاغ سے آگے میری کچھ ذمہ داری نہیں ہے، اپنا رئیس مملکت، قاضی اور سپہ سالار آپ حضرات خود منتخب کریں۔ مخالفین اعتراض کرتے، سائلین اپنے شکوک رفع کرنے کے لئے آتے اور مومنین کسی چیز کی تشریح یا کسی متعرض کا جواب مانگتے تو آپ صاف کہہ دیتے کہ بھائی، یہ باتیں اُس سے پوچھو جس نے کتاب بھیجی ہے، مجھے تو جو کچھ دے کر بھیجا گیا تھا وہ میں نے پہنچا دیا۔ پھر جب خود رسول کی حیثیت بھی مبلغ سے زیادہ کچھ نہ تھی، اور یہ دوسری تمام ذمہ داریاں اس کے منصب سے متعلق نہ تھیں تو کسی دوسرے کا یہ منصب کیسے ہو گیا کہ کتاب اللہ کی تشریح و تفسیر و تعبیر کرنے بیٹھے، اور تعلیمات قرآن اور معارف القرآن لکھے؟

آخر اس کا آپ کیا علاج کریں گے کہ تاریخ سے ناقابلِ انکار حد تک یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً وہ ساری ذمہ داریاں سنبھالیں جو اوپر مذکور ہوئیں؟ اس تاریخ کو آپ کسی طرح جھٹلا نہیں سکتے۔ اب کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ رسول کو خدا نے جو منصب دیا تھا، رسول نے زبردستی اس سے تجاوز کر ڈالا اور وہ حیثیت اختیار کر لی جو دراصل اس کو نہیں دی گئی تھی؟

فتنے کی جڑ ایک خود ساختہ نظریہ پہلے سے ذہن میں خوب اچھی طرح جما کر جو آدمی بھی قرآن کو پڑھتا ہے اس کے لیے قرآن کے نورانی خزانوں کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور بالکل سیدھی سادی باتیں بھی اس کی گرفت میں نہیں آتیں۔ جس فتنے پر ہم گفتگو کرنے کے لیے یہ بحث چھیڑ رہے ہیں وہ اس طرح نمودار نہیں ہوا کہ پہلے قرآن میں وَمَا عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلَاغ اور اس طرح کی آیات کو پڑھ کر کچھ لوگوں نے ایک فکری رہنمائی حاصل کی ہو اور پھر اس رہنمائی سے انہوں نے یہ نظریہ قائم کر لیا ہو، بلکہ وہ اس طرح رونما ہوا ہے کہ پہلے حدیث سے ان کا دل اچاٹ ہوا، پھر سنت کی شرعی حیثیت سے انکار کرنے پر طبیعت مائل ہوئی، پھر آگے چلے تو دیکھا کہ پورے تیرہ سو برس کے اسلامی لٹریچر میں رسول کی جو "اتھارٹی" پائی جاتی ہے وہ اگر جوں کی توں رہے تو سنت کی شرعی اہمیت سے انکار ممکن نہیں رہتا۔ تب انہیں یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ رسول کی اس اتھارٹی کو ختم کیا جائے اور اس غرض کے لیے وہ قرآن کھول کر بیٹھے۔ یہاں انہوں نے ڈھونڈنا

شروع کیا کہ کوئی لفظ یا فقرہ مفید مطلب مل جائے۔ مذکورہ بالا آیات پر نظر پڑ گئی۔ ان کا لفظی ترجمہ جو دیکھا تو دل کی کلی کھل گئی۔ فتنہ زدہ اور فتنہ طلب دماغ ایسے مواقع پر کبھی نہیں سوچا کرتا کہ جن آیات کے ظاہری الفاظ سے وہ ناجائز استفادہ کرنے لگا ہے ان کو ایک غلط مدعا کا حامل بنانے سے کتنے اور اشکال پیدا ہو جائیں گے بلکہ وہ کھٹ سے فیصلہ دے دیتا ہے اور قرآن کو اپنے نظریے کی شہادت میں ساتھ لے کر چل کھڑا ہوتا ہے۔

اصل مدعا | سوچنے کی چیز یہ تھی کہ ایسی آیات میں منصب بلاغ کا اثبات آخر کس چیز کی نفی کرنے کے لیے کیا گیا ہے؟ "مَا" میں تردید کس چیز کی ہے اور پھر اس کے مقابلے میں "اِلَّا" کس شے کے لزوم کو سامنے لاتا ہے؟ یہی سوچنے کی بات تھی مگر افسوس کہ ہمارے جدید مفسرین نہیں سوچ سکے لیکن یہ حقیقت قرآن نے خود ہی واضح کر دی ہے، اور وہ یہ ہے کہ ان آیات میں نفی حسب ذیل امور کی کی گئی ہے:۔

اوّل:۔ نبی کوئی صاحب غرض آدمی نہیں ہے کہ اگر تم اس کی بات مان لوگے تو اس پر اسے کچھ اجر تم سے حاصل کرنا ہے، اور نہ مانو گے تو وہ اپنی اُجرت سے محروم رہ جائے گا۔

دوم:۔ نبی سے آخرت میں یہ باز پرس نہیں ہوئی ہے کہ اس نے تم سے بات منوالی تھی یا نہیں، بلکہ اس سے حساب اتنا ہی لیا جانا ہے کہ کماحقہٗ بات پہنچادی تھی یا نہیں۔

سوم: نبی تمہارے لیے داروغہ اور جبّار اور وکیل نہیں بنایا گیا کہ جس دعوت پر ایمان لانے میں تمہارا اپنا فائدہ ہے اسے اگر تم اپنی حماقت کی وجہ سے نہ مانو تو وہ ڈنڈے کے زور سے زبردستی تم سے منوائے۔

یہاں اس معنی کی چند آیات کو ہم پیش کیے دیتے ہیں تاکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے:۔

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ احْذَرُوْا ج فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ٥ (المائدہ - ۱۲)	اور اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسول کی، اور سنبھل جاؤ! پھر اس انتباہ کے بعد بھی) اگر تم اطاعت سے روگردانی کرو تو یہ بات جان لو کہ ہمارے رسول کے اوپر بات کو کھول کر پہنچا دینے سے زیادہ کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

یہ تتمہ ہے شراب اور جوئے اور پانسے وغیرہ کی نہی کا، اور اس سے قبل کے فقرے میں مسلمانوں کو

چوکنا کیا گیا ہے کہ شیطان اِن چیزوں کے ذریعے تمہیں نماز اور ذکر سے غافل کرنا چاہتا ہے۔ پھر بڑے سخت انداز میں کہا گیا کہ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ؟ (پھر کیا تم باز نہیں آنے کے ؟)۔ اس کے بعد فرمایا کہ خدا کے احکام اور رسول کے فرمودات کی پیروی کرو، لیکن اگر تم انحراف کرتے ہو تو خدا کے سامنے رسول صرف ہمارے احکام کو ٹھیک ٹھیک پہنچا دینے کا ذمہ دار ہے تمہارے دلوں کو بدلنے اور ان احکام کا احترام تمہاری روحوں میں پیدا کر دینے پر وہ مامور نہیں ہے۔ "فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ" کے الفاظ یہ بھی واضح کر رہے ہیں کہ خطاب کا رُخ خصوصیت کے ساتھ ایسے مسلمانوں کی طرف ہے جو اصلاح پذیری میں پھسڈی ہیں!

اسی طرح کعبہ کے بیتِ حرام ہونے اور شہر حرام اور قربانیوں کے جانوروں کے واجب الاحترام ہونے کا بیان کرنے کے بعد یوں فرمایا کہ:-

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ۝ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ۝ (المائدہ - ۱۳)

جان لو کہ اللہ سخت گرفت کرنے والا ہے اور یہ بھی کہ وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ رسول پر کوئی ذمہ داری بات پہنچا دینے کے سوا نہیں ہے۔ اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ چھپاتے ہو، سب کو اللہ جانتا ہے۔

یہاں بھی واضح کیا گیا ہے رسول کی ذمہ داری کے حدود کو اس پہلو سے کہ وہ دلوں اور روحوں کو بدلنے کا ذمہ دار نہیں ہے، اس کا فرض تو منشائے الٰہی کو تم تک پہنچا دینا ہے۔ باقی عذاب دینے اور مغفرت کرنے والا تو خود اللہ تعالیٰ ہے اور وہ ظاہری اعمال کو بھی اور دلوں کے پوشیدہ کوائف کو بھی جانتا ہے

پھر ایک اور مقام پر بات مزید کھل جاتی ہے۔ منکرین جب اعتراض اٹھاتے ہیں کہ یہ رسول صاحب عجب ہیں کہ بیوی بچے رکھتے ہیں اور کوئی معجزہ دکھلانے یا عذاب وارد کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتے، دوسرے لفظوں میں یہ انسانوں جیسے انسان ہیں، تو اس کا جواب دینے کے لیے نبی صلعم سے خطاب کرتے ہوئے یہ بات منکرین کے کانوں میں ڈالی جاتی ہے کہ:-

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ۭ وَمَا

ہم نے تم سے پہلے بھی رسول بھیجے ہیں اور ان کو بیوی بچے عطا کیے۔ کسی رسول کے بس میں یہ نہیں تھا کہ وہ کوئی

مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۔۔۔۔۔ وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ؀ (الرعد - ۱۲)

نشانی بغیر اذنِ الٰہی کے (بطور خود) لے آئے۔ (ہمارے ہاں) ہر آنے والی گھڑی کے لیے اندراج ہے ۔۔۔۔۔ اور ہم چاہیں تو ان منکرین سے جس عذاب کا وعدہ کر رہے ہیں اس کا کچھ حصہ تم کو (زندگی ہی میں) دکھا دیں یا چاہیں تو تم کو وفات دے دیں، تمہارے اوپر ذمہ داری صرف بات پہنچا دینے کی ہے، حساب لینا تو خود ہمارا کام ہے۔

یہاں نبی کا منصب "بلاغ" بتایا تو اس کے مقابلے میں نفی جس چیز کی مطلوب تھی وہ کھول دی کہ حساب لینا اور موعودہ عذاب وارد کرنا نبی کا کام نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ کا کام ہے اور اس کے لیے اس کے ہاں ایک وقت معین ہے جس کا باقاعدہ اندراج ہے۔

پھر بات اور کھلتی ہے۔ منافقین پر گفتگو کرتے فرمایا:۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ؀ (النور - ۱۲۰)

اے نبی! ان سے کہدو کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر تم انحراف کرو تو سمجھ لو کہ اُس کے ذمہ وہی کچھ ہے جس کا ذمہ دار اسے بنایا گیا ہے اور تمہارے ذمے وہ کچھ ہے جس کے ذمہ دار تم بنائے گئے ہو، اور اگر تم رسول کی اطاعت کرو تو خود تم ہی ہدایت پاؤ گے، اور رسول کے اوپر بات کھول کر پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

یہاں بھی رسول کو بلاغ مبین کا ذمہ دار قرار دے کر نفی جس چیز کی کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ایمان اور اطاعت میں اخلاص پیدا کر دینا نبی کے کرنے کا کام نہیں ہے۔ یہ تو خود ان لوگوں کا کام ہے جو ایمان کا دعویٰ کر کے مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہوں۔ نبی کی ذمہ داری خدا کے احکام پہنچا کر ختم ہو جاتی ہے اب جو کوئی اخلاص کے ساتھ اطاعت کرے گا، خود ہی راہِ راست پائے گا، اور جو منافقت سے کام لے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔

اور ملاحظہ ہو :-

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (الغاشیہ-۱)

(پس (اے نبی) نصیحت کرو، تم ہو ہی نصیحت کرنے والے — اِن (منکرین) کے اوپر تم داروغہ مقرر نہیں کیے گئے۔

- یہاں بھی نفی جس چیز کی تھی اس کی تصریح کر دی گئی کہ نبی کا کام مُصَیْطِر کا کام نہیں ہے، مُذَکِّر کا کام ہے۔ اسی حقیقت کو یوں بھی کھولا کہ :-

نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَا يَقُولُونَ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ قف فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدِ ۝ (ق-۳۰)

ہمیں معلوم ہے وہ (منکرین) جو جو کچھ کہتے ہیں اور تم ان پر جبار نہیں ہو۔ پس جو وعید سے ڈریں ان کو قرآن کے ذریعے نصیحت کرو!

نبی کا کام تذکیر ہے اور اس کے مقابلے میں اس کا کام جو نہیں ہے وہ جبّاری ہے! اسی طرح سورہ ص (رع ۵) میں تصریح کی گئی ہے کہ نبی فقط "نذیرِ مبین" ہوتا ہے، اس کو ملاءِ اعلیٰ کے ہنگاموں کا جائزہ لینے پر مقرر نہیں کیا گیا۔ پھر اسی سورہ ص (رع ۵) کے آخر میں ہے کہ :-

قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ -

(اے نبی) کہو کہ میں تم سے اس کام کی کوئی اجرت نہیں مانگتا اور نہ میں تکلف کیشوں میں سے ہوں — یہ تو بس جہان والوں کے لیے نصیحت ہے۔

یعنی نصیحت کرنا نبی کی ڈیوٹی ہے، نہ کہ "ملّیشیہ"!

یہ چند مواقعِ کلام بطورِ نمونہ لیے گئے ہیں۔ اِن سے صاف واضح ہو رہا ہے کہ جہاں کہیں یہ بات پورا زور دے کر بیان کی گئی ہے کہ نبی تو بس بلاغ اور تذکیر اور انذار پر مامور ہے، وہاں بیان کا مقصود یہ نہیں ہے کہ نبی اس کام کے سوا اور کسی کام پر مامور نہیں ہے، بلکہ اصل مقصود یہ بتانا ہے کہ نبی اُن کاموں پر مامور نہیں ہے جو کفار اور منافقین اور ضعیف الایمان لوگوں نے اس کے کرنے کے کام سمجھ لیے ہیں۔ نبی سے لوگوں کے کفر و ایمان کا حساب نہیں لیا جاتا ہے۔ نبی پر بات کو دلوں میں اتارنے کی ذمہ داری

نہیں ہے۔ نبی داروغہ اور وکیل اور جبار نہیں ہے۔ نبی کی کوئی ذاتی غرض اٹکی ہوئی نہیں ہے۔ نبی کو جھٹلانے میں نبی کا کوئی دنیوی و اخروی نقصان نہیں بلکہ نقصان خود جھٹلانے والوں کا ہے۔ نبی کا کام منکرین اور منافقین پر عذاب نازل کرنا نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کا کام ہے۔ یہ سب غلط حیثیتیں جو نبی کی سمجھ لی گئی ہیں ان کے مقابلے میں اس کی حیثیت محض ایک ناصح اور مبلغ کی ہے اور تبلیغ و نصیحت کے بعد اس کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی دوسری بات یہ بھی نمایاں ہو جاتی ہے کہ ایسے مواقع کلام میں سے بیشتر وہ ہیں جن کا خطاب کھلے کھلے منکرین و معاندین سے ہے (بسا اوقات مخاطب نبی صلعم کو کیا گیا ہے لیکن روئے سخن مخالفین کی طرف ہے)، اور کچھ مواقع ایسے ہیں کہ زد پر منافقین ہیں، اور جہاں مسلمانوں سے خطاب ہے وہاں اگرچہ بظاہر خطاب عام ہے لیکن تنبیہ کا انداز خود بتاتا ہے کہ تعمیل میں کوتاہی کرنے والے خاص طور پر پیش نظر ہیں۔ اس حقیقت کو جان لینے سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ نبی کی ذمہ داری بلاغ، تذکیر اور انذار تک محدود اگر ہے تو مخالفین، معاندین، منافقین اور کوتاہ عملوں کو مومن و مخلص بنانے اور ان پر عذاب نازل کرنے کے معاملہ میں ہے، نہ یہ کہ منصب نبوت سراسر بلاغ و تذکیر ہی تک محدود ہے اور مطلقاً اس کے سوا نبی کا اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔

اب آپ خود اندازہ کیجیے کہ جن حضرات نے اپنے آپ کو حدیث کے دفاتر کے مطالعہ سے فارغ کر کے یکسر تدبر قرآن میں لگا دیا ہے ان کی قرآن فہمی کا عالم کیا ہے! منصب رسالت کی بیشمار ذمہ داریاں بلاغ و تذکیر اور انذار کے علاوہ بھی تھیں ان سب پر ہاتھ صاف کر دیا گیا۔

"بلاغ" تو رسول کی بالکل ابتدائی ذمہ داری ہے۔ یعنی اگر کوئی اس کا پیغام سننے کے بعد ماننے سے انکار کر دے یا اخلاص کے ساتھ نہ مانے تو اس کے معاملے میں رسول کا کام بلاغ پر ختم ہو جاتا ہے۔ مگر جو لوگ اسے مان لیں اور اطاعت پر آمادہ ہوں، ان کے معاملے میں رسول کی ذمہ داری محض بلاغ پر کیسے ختم ہو سکتی ہے؟ پھر تو لازماً دوسری ذمہ داریاں شروع ہو جائیں گی۔ اگرچہ ان ذمہ داریوں کو انجام دینے کے دوران میں بھی ہر قدم پر "بلاغ" کا کام اپنی جگہ ہوتا رہے گا، مگر بلاغ کے ساتھ ساتھ دوسرے

فرائض بھی ہونگے جن کی انجام دہی رسول کے لیے ویسی ہی ضروری ہے جیسے خود بلاغ کی۔

آئیے ہم منصب رسالت کی دوسری بڑی بڑی ذمہ داریوں کے بارے میں قرآن سے تحقیق کریں۔

تبیین کتاب | قرآن نے نبی صلعم کا ایک بہت ہی اہم فریضہ ذیل کی آیات میں نمایاں کر دیا ہے:۔

وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (نحل - ع ٦)

اے محمدؐ! ہم نے یہ ذکر تم پر اس لیے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے لیے اس ذکر کی تشریح و توضیح کرو جو ان کی طرف بھیجا گیا ہے۔ شاید کہ وہ سوچ بچار سے کام لے سکیں۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ۔ (نحل - ٨)

بخدا! ہم نے تم سے پہلے بھی بہت سی امتوں کو اپنا پیغام بھیجا تھا، لیکن انہوں نے اسے ضائع کر دیا پھر شیطان نے ان کے غلط اعمال کو ان کے لیے خوشنما بنا دیا اور آج وہی ان کا کارپرداز بنا ہوا ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے اور (اے محمدؐ!) تمہارے اوپر الکتاب نازل کرنے سے ہمارا مدعا ہی یہ ہے کہ تم ان پر وہ سب کچھ واضح کر دو جس میں وہ باہم اختلاف کر رہے ہیں۔

دونوں آیتیں گواہ ہیں کہ کتاب کو ایک رسول کے ذریعہ سے بھیجنا کوئی غیر ضروری تکلف نہ تھا، بلکہ ایک اہم مقصد تھا جو رسول کے بغیر محض کتاب سے پورا نہ ہوسکتا تھا۔ پہلی آیت اشارہ کرتی ہے کہ لوگوں کو یہ بتانا رسول کا فرض ہے کہ کتاب کا مقصد و مدعا کیا ہے؟ وہ ان سے کن چیزوں کے قبول و ترک کا مطالبہ کرتی ہے؟ اس کے احکام زندگی کے عملی معاملات پر کیونکر منطبق ہوتے ہیں؟ اور اس کے منشا کی عملی تفسیر کیا ہے؟ یہ وضاحت اس حد تک ہونی چاہیے کہ لوگوں میں خود سوچنے کی قوتیں متحرک ہو جائیں! ظاہر بات ہے کہ مطالبہ صرف کتاب کے الفاظ کی قرأت سے کسی زائد چیز کا ہے۔ انبیاء و رسل صرف کتابِ الٰہی پڑھ کر سنا دینے پر مامور نہیں ہیں، بلکہ اس کے ایک ایک جملے کے مفہوم و منطوق اور منشاء و تقاضا کو واضح کرنے کے ذمہ دار بھی ہیں۔ دوسری آیت بتاتی ہے کہ سابق امتیں دینِ برحق سے برگشتہ ہو کر عقائد و

احکام کے جن اختلافات میں پڑ گئی ہیں ان کو دور کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ الکتاب کے مطالب کی پوری پوری "تبیین" کریں، وضاحت فرمائیں، اس کے مضمرات کو نمایاں کر کے رکھ دیں اور اس کے اشارات کو شرح و بسط سے سامنے لائیں۔ یہ دوسری آیت پہلی آیت کے مدعا کو اور زیادہ نکھار دیتی ہے۔ یعنی رسول اللہ پر کتاب بھیجنے کی اصل غرض و غایت ہی یہ ہے کہ آپ اسکی تبیین فرمائیں۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ قرآن تو خود مبین ہے، خود واضح ہے، خود جامع ہے، آپ اپنی تشریح ہے پھر یہ "تبیین" کیسی؟ دراصل قرآن کے فی نفسہ مبین ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ کسی شرح کا اور کسی تبیین کا ضرورت مند نہیں۔ بلکہ اس کے مبین ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ایک فصیح اور معیاری زبان میں اترا ہے، وہ بہترین ادبی و دعوتی اسلوب کا حامل ہے، وہ دین کے اصول و اساسات کو پیش کرنے میں کہیں کوئی کوتاہی نہیں کرتا۔ اس لحاظ سے قرآن یقیناً مبین ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک کودن سے کودن آدمی بھی اسے پڑھ کر وہی کچھ پا سکتا ہے جو ایک راسخ العلم آدمی اس سے اخذ کرتا ہے، ایک عامی اس سے اسی طرح مدعا کا استنباط کر سکتا ہے جس طرح ایک مفکر۔ یا ایک متعصب آدمی اس سے ویسا ہی استفادہ کر سکتا ہے، جیسے ایک راستباز طالب علم! قرآن فی نفسہ تو انتہائی حد تک مبین ہے، لیکن اس کے مختلف قارئین اور سامعین اس کو سمجھنے کے لیے اپنے ذہنی احوال کے لحاظ سے مختلف درجوں میں تبیین رسالت کے ضرورت مند ہیں۔ قرآن کے مدعا کو پانے کے لیے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذہن جس انتہائی بلند معیار پر فائز تھا اس پر کوئی دوسرا انسانی دماغ نہیں پہنچ سکتا۔ الکتاب کے کمال فہم میں الرسول کا دماغ ایک ہی دماغ ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد صف اول کے ذہین لوگ اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ پھر صف دوم کے لوگ اور پھر تیسرے اور چوتھے درجے کے لوگ آتے ہیں کہ جن کو سیدھی سیدھی باتیں جذب کرنے میں بھی بڑی دیر لگتی ہے اور بڑی الجھنیں پیش آتی ہیں۔ اسی طرح دوسرے پہلو سے دیکھیے تو اندازہ ہو گا کہ الکتاب سے اکتساب فیض کرنے کے لیے دل و دماغ کا تعصبات، اہواء اور ماحول کے اثرات سے معیاری حد تک پاک ہونا صرف الرسول ہی کے حصے میں تھا۔ وہاں ان آلائشوں کا شائبہ بھی نہ تھا اس لیے وہاں ایک ادنیٰ سا الہامی اشارہ بھی دور رس اور وسیع حقائق کو پا لینے کے

لیے کافی ہو جاتا تھا۔ الرسول کے بعد پھر ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے ذکی و فہیم اور صاف ذہن رکھنے والے طالبانِ حق اور فدایانِ حق تھے کہ جن کے لیے شاذ ہی کسی حقیقت کے جذب کرنے میں کوئی نفسیاتی کمزوری مانع ہوئی۔ پھر صفِ دوم کے دل و دماغ سامنے آتے ہیں جن کو اپنے نفسیات اور قرآنی تقاضوں کے درمیان ایک لمبی کشمکش میں سے گذرنے کے بعد فہم کتاب کا مقام ملا۔ پھر صفِ سوم کے لوگ تھے کہ جن کی ساری عمر اسی کشمکش میں گذری، لیکن بہرحال انہوں نے اپنی نفسیاتی کمزوریوں کے آگے سپر نہیں ڈالی۔ پھر درجہ چہارم کے لوگ آتے ہیں کہ جنہوں نے الکتاب کو برسوں پڑھا اور رٹا مگر اس کی سیدھی باتوں میں سے ٹیڑھ کے سوا کچھ نہ پا سکے۔ پس قرآن فی نفسہٖ مبین ہونے کے باوجود اپنے مخاطبین کے ذہنی و نفسیاتی احوال کے لحاظ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبیین کا محتاج تھا۔

ایک دعوت رکھنے والی کتاب کا خاصہ ہے کہ اس کے ظہور پر ماحول میں فکری تصادم برپا ہوتا ہے۔ فکری تصادم کی حالت جہاں کہیں پیدا ہوتی ہے وہاں گوناگوں سوالات اور اشکالات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ سوالات سنجیدہ بھی ہوتے ہیں، بیہودہ بھی۔ سمجھنے کے لیے بھی ہوتے ہیں، شرارت کے لیے بھی۔ اصولی بھی ہوتے ہیں، جزئی بھی۔ فوری جواب دینے کے لیے بھی ہوتے ہیں، تاخیر سے جواب دینے کے بھی۔ اجمالی بھی ہوتے ہیں تفصیل طلب بھی۔ فلسفیانہ بھی ہوتے ہیں، عمل پسندانہ بھی۔ وقتی بھی ہوتے ہیں اور مستقل بھی۔ ایک قومی و ملکی ماحول کے لیے خاص بھی ہوتے ہیں اور زیادہ وسیع بھی۔ یہ ناممکن ہے کہ کسی کتابِ دعوت میں ان تمام سوالات اور ان کے جوابات کو جمع کر کے شائع کر دیا جائے۔[ل] کیونکہ اس طرح تو ایک "انسائیکلوپیڈیا" مرتب ہو جائے گی اور اس سے دعوتِ عام کا کام نہ لیا جا سکے گا۔ علاوہ بریں ایک ہی سوال کا ایک جواب مختلف اشخاص کے سامنے یا مختلف قسم کے حالات میں مختلف اسالیب سے پیش کیا جانا لازم ہوتا ہے۔ کہیں جواب میں ایک پہلو کو زیادہ نمایاں کرنا ہوتا ہے کہیں کسی دوسرے پہلو کو! ریاضی کے سوالات کی طرح دعوت

ل قرآن میں مخالفین اور مومنین کے بعض ایسے بڑے بڑے سوالات کے جوابات ضرور ملیں گے جو زیادہ عام تھے یا دیر تک تحریکِ اسلامی پر اثر انداز رہے لیکن نبی صلعم نے ذاتی طور پر تبیین کا جو کام اپنی زبان سے کیا ہے اس کا پورا پورا ریکارڈ قرآن میں نہیں ہے۔ حدیث کے دفتر میں بھی صرف اس کا جوہر مل سکتا ہے!

کے کام میں سوالات کے ملگے بندھے جوابات ہرجگہ کام نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اپنی تبیین کا فریضہ پوری طرح خود ہی ادا نہیں کر دیا ہے بلکہ اس کام کا بڑا حصہ نبی صلعم کو تفویض کیا ہے۔

حیرت اس پر ہوتی ہے کہ جو لوگ قرآن کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبیین کو آج غیر ضروری قرار دیتے ہیں وہ اپنے دور میں خود اسی تبیین کی مسند پر براجمان ہیں۔ وہ صفحات کے صفحات قرآن کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملے پر لکھ کر لوگوں کو یہ بتاتے ہیں کہ فلاں مقام پر قرآن کا مدعا یہ ہے اور یہ نہیں ہے، اس نے حکم یہ نہیں دیا وہ دیا ہے، اس کی تشریح فلاں طرح ٹھیک نہیں فلاں طرح ٹھیک ہے، اس کی فلاں اصطلاح کا مطلب وہ نہیں یہ ہے۔ ہم دریافت کرتے ہیں کہ اگر قرآن باہر سے کسی تبیین کا محتاج نہیں اور اپنے ہر قاری کے لیے آپ ہی اپنا کامل مفسر ہے تو آخر بیچ میں جناب کا یہ منصب تفسیر کیسے نکل آیا؟ یہی منصب اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہو تو آپ کو اس پر اعتراض ہے، لیکن جب اس منصب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہٹا کر آپ خود اس پر آبیٹھتے ہیں تو یہ قابل اعتراض نہیں! یہ کیا قصہ ہے؟ خارج سے تبیین کا انکار کرنے کے بعد آپ ساری تفاسیر اور سارے ذخیرۂ احادیث اور سارے دفاتر فقہ و کلام کو دریا برد کرنے پر بضد ہیں، لیکن اس کے بعد پھر آپ قرآن اور اس کے مخاطبوں کو تنہا نہیں چھوڑ دیتے کہ وہ ایک دوسرے کو خود ہی جانیں بلکہ آپ ان دونوں کے بیچ میں قرآن کی خود نوشت تفسیریں لے کے آجاتے ہیں اور "تبیین" کا ایک بڑا اڈا جما کر بیٹھ جاتے ہیں۔ رسول اللہ کی تبیین سے اگر آپ کو انکار کرنا تھا تو پہلے اپنے حق تبیین سے دست بردار ہونا چاہیے تھا۔ آپ نے تو نعوذ باللہ رسول اللہ کی جگہ لے لی!

بہرحال جو لوگ تبیین رسالت سے قرآن کو بے نیاز قرار دیتے ہیں اور اسے اپنی جگہ کامل مبین مانتے ہیں خود ان کی اپنی قلمی سرگرمیاں ان کے خلاف، ایک ٹھوس واقعاتی شہادت ہیں، بلکہ اسے "اعتراف" کہنا زیادہ صحیح ہے۔

اب ہم خود قرآن ہی کے ذریعے یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ تبیین کتاب اور تبیین ذکر کا ایک وسیع مفہوم قرار دے کر ہم اسے رسالت کے ایک اہم منصب کی حیثیت سے بطور خود پیش نہیں کر رہے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس فریضہ تبیین کی وسعتوں کو خود ہی ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ از روئے قرآن اس فریضہ کے چار پہلو یا چار شعبے ایسے ہیں کہ نبی ان میں کام کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اشاعت آئندہ میں ہم ان شعبوں کا ذکر کریں گے۔

رسائل و مسائل

کیا بالغ عورت خود اپنا نکاح کر لینے کی مجاز ہے؟

سوال: "علماء احناف اور علماء اہلِ حدیث کے درمیان نکاح بالغہ بلا ولی کے مسئلہ میں عام طور پر اختلاف پایا جاتا ہے۔ احناف اس کے قائل ہیں کہ بالغہ عورت اپنا نکاح اولیاء کے اذن کے بغیر یا اُن کی خواہش کے علی الرغم، جہاں چاہے کر سکتی ہے اور اس نکاح پر اولیاء کو اعتراض کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اس کے برعکس اہلِ حدیث حضرات ایسے نکاح کو باطل اور کالعدم قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نکاح بلا ولی کی صورت میں بلا تامل دوسرا نکاح کیا جا سکتا ہے۔ فریقین کے دلائل، جہاں تک میرے سامنے ہیں، مختصراً پیش کرتا ہوں اور استدعا کرتا ہوں کہ آپ اس بارے میں اپنی تحقیق واضح فرمائیں۔"

اس سوال کے ساتھ سائل نے پوری تفصیل کے ساتھ فریقین کے دلائل جمع کر دیئے ہیں جنہیں یہاں نقل کیا جاتا ہے:-

حنفیہ کا استدلال حسب ذیل آیات اور احادیث سے ہے:-

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ	تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں
أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ	تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے دس دن روکے رکھیں
أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ۚ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ	پھر جب ان کی عدت پوری ہو جائے تو جو کچھ وہ
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ	اپنی ذات کے معاملے میں معروف طریقے سے
بِالْمَعْرُوفِ ط (البقرہ- ۳۰)	کریں، اس کی تم پر کوئی ذمہ داری نہیں۔
فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ	پھر اگر (تیسری بار شوہر نے بیوی کو) طلاق دے

حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ ط . . . .

(البقرہ - ۲۹۰

دی، تو وہ عورت اُس کے لیے حلال نہ ہوگی اِلّا یہ کہ وہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے۔

. . . . فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ یَّنْکِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَیْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ -

(البقرہ - ۳۰)

. . . . پھر تم ان عورتوں کو اس سے مت روکو کہ وہ اپنے زیر تجویز شوہروں سے نکاح کریں، جب کہ وہ بھلے طریقے سے باہم رضامند ہو جائیں۔

عَنْ نَافِعِ ابْنِ جُبَیْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْاَیِّمُ اَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَّلِیِّهَا وَالْبِکْرُ تُسْتَاْمَرُ وَاِذْنُهَا سُکُوْتُهَا وَفِیْ رِوَایَةٍ اَلثَّیِّبُ اَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَّلِیِّهَا۔

(نصب الرایہ ج ۳ ص ۱۹۲)

نافع ابن جبیر نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیوہ عورت اپنے ولی سے زیادہ خود اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کی حقدار ہے اور کنواری کا مشورہ لیا جانا چاہیے اور اس کی اجازت اُس کی خاموشی ہے اور ایک روایت میں ہے کہ شوہر دیدہ عورت اپنے ولی سے زیادہ اپنے نکاح کے معاملے میں حقدار ہے۔

عَنْ اَبِیْ سَلَمَةَ ابْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ قَالَ جَاءَتْ اِمْرَاَةٌ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ اِنَّ اَبِیْ اَنْکَحَنِیْ رَجُلًا وَّاَنَا کَارِهَةٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِاَبِیْهَا لَا نِکَاحَ لَکَ اِذْهَبِیْ فَانْکِحِیْ مَنْ شِئْتِ

(ایضاً)

ابی سلمہ ابن عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا میرے باپ نے میرا نکاح ایک مرد سے کر دیا ہے اور میں اسے ناپسند کرتی ہوں آپ نے باپ سے فرمایا کہ نکاح کا اختیار تمہیں نہیں ہے اور لڑکی سے فرمایا جاؤ جس سے تمہارا جی چاہے نکاح کر لو۔

رُوِیَ مِنْ طَرِیْقِ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ ابْنِ الْقَاسِمِ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا

مالک نے عبدالرحمٰن سے، انہوں نے اپنے باپ سے، اور انہوں نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے

زَوَّجَتْ حَفْصَةَ بِنْتَ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ مِنَ الْمُنْذِرِ ابْنِ زُبَيْرٍ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ غَائِبٌ بِالشَّامِ۔ فَلَمَّا قَدِمَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ قَالَ وَمِثْلِي يُفْتَاتُ عَلَيْهِ؟ فَكَلَّمَتْ عَائِشَةُ الْمُنْذِرَ ابْنَ زُبَيْرٍ فَقَالَ اِنَّ ذٰلِكَ بِيَدِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ۔ فَقَالَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ مَا كُنْتُ لِاَرُدَّ اَمْرًا قَضَيْتِيْهِ فَاسْتَقَرَّتْ حَفْصَةُ عِنْدَ الْمُنْذِرِ وَلَمْ يَكُنْ ذٰلِكَ طَلَاقًا (ایضاً)

کہ انہوں نے حفصہ بنت عبدالرحمٰن کا منذر ابن زبیر سے نکاح کر دیا۔ اس وقت عبدالرحمٰن شام میں تھے۔ جب وہ واپس آئے تو کہنے لگے کہ کیا میری رائے کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟ تب حضرت عائشہ نے منذر ابن زبیر سے بات کی، انہوں نے کہا کہ فیصلہ عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں ہے۔ اس پر عبدالرحمٰن نے حضرت عائشہ سے کہا کہ جس معاملے کو آپ نے طے کر دیا ہے میں اس کی تردید نہیں کرنا چاہتا۔ چنانچہ حفصہ منذر کے پاس ہی رہیں اور یہ طلاق نہ تھی۔

اَخْرَجَهُ اَبُوْدَاؤُدَ وَالنَّسَائِيُّ … عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ لِلْوَلِيِّ مَعَ الثَّيِّبِ اَمْرٌ (ایضاً)

ابوداؤد اور نسائی نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شوہر دیدہ عورت پر ولی کو کچھ اختیار حاصل نہیں ہے۔

اَخْرَجَهُ النَّسَائِيُّ وَاَحْمَدُ … عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ جَاءَتْ فَتَاةٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اَبِيْ زَوَّجَنِي ابْنَ اَخِيْهِ لِيَرْفَعَ بِيْ مِنْ خَسِيْسَتِهِ۔ قَالَ فَجَعَلَ الْاَمْرَ اِلَيْهَا فَقَالَتْ اِنِّيْ قَدْ اَجَزْتُ مَا صَنَعَ اَبِيْ وَلٰكِنْ اَرَدْتُ اَنْ تَعْلَمَ النِّسَاءُ اَنْ لَيْسَ

نسائی اور احمد نے حضرت عائشہ سے روایت کی ہے کہ ایک لڑکی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی اے اللہ کے رسول! میرے باپ نے اپنے بھتیجے کے ساتھ میرا بیاہ صرف اس لیے کر دیا ہے کہ میرے ذریعے سے اسے ذلت سے نکالے۔ آپ نے نکاح (کی تنسیخ و استقرار) کا حق لڑکی کو دے دیا۔ لڑکی نے کہا، میرے والد نے جو کچھ کیا ہے، میں اسے جائز قرار دیتی ہوں۔ میری خواہش صرف یہ تھی

اِلَی الْاٰبَاءِ مِنَ الْاَمْرِ شَیْئٌ — کہ عورتیں جانتی ہیں کہ باپوں کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

اہل حدیث حضرات اپنی تائید میں مندرجہ ذیل احادیث پیش کرتے ہیں :-

عَنْ عَائِشَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیُّمَا امْرَاَۃٍ نَکَحَتْ بِغَیْرِ اِذْنِ وَلِیِّھَا فَنِکَاحُھَا بَاطِلٌ . . . فَاِنِ اشْتَجَرُوْا فَالسُّلْطَانُ وَلِیُّ مَنْ لَّا وَلِیَّ لَھَا۔ (بلوغ المرام)

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو عورت بھی اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کرے، اُس کا نکاح باطل ہے . . . پس اگر جھگڑا ہو تو جس عورت کا ولی نہ ہو تو سلطان اُس کا ولی ہے۔

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی عَنْ اَبِیْہِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا نِکَاحَ اِلَّا بِوَلِیٍّ (ایضاً)

ابو موسیٰ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ولی کے بغیر کوئی نکاح جائز نہیں ہے"۔

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تُزَوِّجُ الْمَرْاَۃُ الْمَرْاَۃَ وَلَا تُزَوِّجُ الْمَرْاَۃُ نَفْسَھَا (سنن کبریٰ للبیہقی)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک عورت دوسری عورت کا ولی بن کر نکاح نہ کرے، اور نہ کوئی عورت خود اپنا نکاح کرے۔

قَالَ عُمَرُ ابْنُ الْخَطَّابِ اَیُّمَا امْرَاَۃٍ لَمْ یُنْکِحْھَا الْوَلِیُّ اَوِ الْوُلَاۃُ فَنِکَاحُھَا بَاطِلٌ۔ (ایضاً)

حضرت عمرؓ نے فرمایا جس عورت کا نکاح ولی یا حکام نہ کریں، اس کا نکاح باطل ہے۔

عَنْ عِکْرِمَۃَ ابْنِ خَالِدٍ قَالَ جَعَلَتْ امْرَاَۃٌ ثَیِّبٌ اَمْرَھَا بِیَدِ رَجُلٍ غَیْرِ وَلِیٍّ

عکرمہ ابن خالد سے روایت ہے کہ ایک شوہر دیدہ عورت نے اپنا معاملہ ایک ایسے

فَانْكَحَهَا فَبَلَغَ ذٰلِكَ عُمَرَ فَجَلَدَ النَّاكِحَ وَالْمُنْكِحَ وَرَدَّ نِكَاحَهَا۔ (ايضاً)

شخص کے سپرد کر دیا جو اس کا ولی نہ تھا اس شخص نے عورت کا نکاح کر دیا حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے نکاح کرنے اور کرانے والے کو کوڑوں کی سزا دی اور نکاح منسوخ کر دیا۔

عَنْ عَلِيٍّ قَالَ اَيُّمَا امْرَاَةٍ نَكَحَتْ بِغَيْرِ اِذْنِ وَلِيِّهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ لَا نِكَاحَ اِلَّا بِاِذْنِ وَلِيٍّ۔ (ايضاً)

حضرت علی نے فرمایا جس عورت نے بھی اپنے ولی کے اذن کے بغیر نکاح کیا اس کا نکاح باطل ہے۔ بلا اجازتِ ولی کوئی نکاح نہیں۔

عَنِ الشَّعْبِيِّ اَنَّ عُمَرَ وَعَلِيًّا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا وَشُرَيْحًا وَمَسْرُوْقًا رَحِمَهُمَا اللّٰهُ قَالُوْا لَا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ۔ (ايضاً)

امام شعبی سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ حضرت عمرؓ شریحؒ اور مسروق نے فرمایا کہ ولی کے بغیر کوئی نکاح نہیں ہے

جواب۔ نکاح بلا ولی کے مسئلہ میں جو اختلاف ہے، اس کے بارے میں فریقین کے دلائل پہلے بھی میری نگاہ میں تھے، اب آپ نے بھی انہیں بیان فرما دیا ہے۔ ان دلائل پر ایک نگاہ ڈالنے سے ہی یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ دونوں طرف کافی وزن ہے اور یہ کہنے کی بالکل گنجائش نہیں ہے کہ فریقین میں سے کسی کا مسلک بالکل غلط ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا شارع نے فی الواقع دو متضاد حکم دیے ہیں؟ یا ایک حکم کو دوسرا حکم منسوخ کرتا ہے؟ یا دونوں حکموں کو ملا کر شارع کا منشاء ٹھیک طور پر متحقق ہو سکتا ہے؟ پہلی شق تو صریحاً باطل ہے کیونکہ شریعت کا پورا نظام شارع کی حکمت کاملہ پر دلالت کر رہا ہے اور حکیم سے متضاد احکام کا صدور ممکن نہیں ہے۔ دوسری شق بھی باطل ہے کیونکہ نسخ کا کوئی ثبوت یا قرینہ موجود نہیں ہے۔ اب صرف تیسری ہی صورت باقی رہ جاتی ہے اور ہمیں اسی کی تحقیق کرنی چاہیے۔ میں دونوں طرف کے دلائل کو جمع کر کے شارع کا جو منشاء سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے:-

ا۔ نکاح کے معاملے میں اصل فریقین مرد اور عورت ہیں نہ کہ مرد اور اولیائے عورت۔ اسی بنا پر ایجاب و قبول ناکح اور منکوحہ کے درمیان ہوتا ہے۔

۲۔ بالغہ عورت (باکرہ ہو یا ثیبہ) کا نکاح اس کی رضامندی کے بغیر یا اس کی مرضی کے خلاف منعقد نہیں ہو سکتا، خواہ وہ نکاح کرنے والا باپ ہی کیوں نہ ہو۔ جس نکاح میں عورت کی طرف سے رضا نہ ہو، اس میں سرے سے ایجاب ہی موجود نہیں ہوتا کہ ایسا نکاح منعقد ہو سکے۔

۳۔ مگر شارع اس کو بھی جائز نہیں رکھتا کہ عورتیں اپنے نکاح کے معاملے میں بالکل ہی خود مختار ہو جائیں، اور جس قسم کے مرد کو چاہیں اپنے اولیا کی مرضی کے خلاف اپنے خاندان میں داماد کی حیثیت سے گھسا لائیں۔ اس لیے جہاں تک عورت کا تعلق ہے، شارع نے اس کے نکاح کے لیے اس کی اپنی مرضی کے ساتھ اس کے ولی کی مرضی کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔ نہ عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے ولی کی اجازت کے بغیر جہاں چاہے اپنا نکاح خود کرے اور نہ ولی کے لیے جائز ہے کہ عورت کی اجازت کے بغیر اس کا نکاح جہاں چاہے کر دے۔

۴۔ اگر کوئی ولی کسی عورت کا نکاح بطور خود کر دے تو وہ عورت کی مرضی پر معلق ہو گا، وہ منظور کرے تو نکاح قائم رہے گا، نامنظور کرے تو معاملہ عدالت میں جانا چاہیے۔ عدالت تحقیق کرے گی کہ یہ نکاح عورت کو منظور ہے یا نہیں۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ عورت کو نکاح نامنظور ہے تو عدالت اسے باطل قرار دے گی۔

۵۔ اگر کوئی عورت اپنے ولی کے بغیر اپنا نکاح خود کرے تو اس کا نکاح ولی کی اجازت پر معلق ہو گا۔ ولی منظور کر لے تو نکاح برقرار رہے گا، نامنظور کرے تو یہ معاملہ بھی عدالت میں جانا چاہیے۔ عدالت تحقیق کرے گی کہ ولی کے اعتراض و انکار کی بنیاد کیا ہے۔ اگر وہ فی الواقع معقول وجوہ کی بنا پر اس مرد کے ساتھ اپنے گھر کی لڑکی کا جوڑ پسند نہیں کرتا تو یہ نکاح فسخ کیا جائے گا اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اس عورت کا نکاح کرنے میں اس کا ولی دانستہ تساہل کرتا رہا، یا کسی ناجائز غرض سے اس کو ٹالتا رہا اور عورت نے تنگ آ کر اپنا نکاح خود کر لیا تو پھر ایسے ولی کو ساقط الاختیار ٹھیرا دیا جائے گا اور نکاح کو عدالت کی طرف سے سند جواز دے دی جائے گی۔ ھٰذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

قتلِ خطا اور اُس کے احکام

سوال: ایک پنساری نے غلطی سے ایک خریدار کو غلط دوائی دی جس سے خریدار خود بھی ہلاک ہوگیا اور دو معصوم بچے (جن کو خریدار نے وہی دوا بے ضرر سمجھ کر دے دی تھی) بھی ضائع ہوئے۔ یہ غلطی پنساری سے بالکل نادانستہ ہوئی۔ خوں بہا اور خدا کے ہاں معافی کی اب کیا سبیل ہے؟ نیز یہ کہ خوں بہا معاف کرنے کا کون مجاز ہے؟

جواب: اسلامی قانون میں قتل کی چار قسمیں ہیں۔ عمد، خطا، شبہ عمد، اور وہ جو ان تینوں میں سے کسی کی تعریف میں نہ آتا ہو۔ یہ فعل جس کا ارتکاب اس پنساری سے ہوا ہے پہلی تین قسموں میں شمار نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ عمد اور شبہ عمد تو بہر حال نہیں ہے، اور یہ قتل خطا بھی نہیں ہے، اس لیے کہ قتل خطا کی تعریف یہ ہے کہ آدمی کسی قاتلانہ ہتھیار کو کسی دوسری چیز پر چلائے مگر غلطی سے وہ لگ جائے کسی انسان کو جسے وہ نہ مارنا چاہتا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ یہ فعل چوتھی قسم ہی میں آتا ہے جس میں سرے سے کسی کو ضرر پہنچانا مقصود ہی نہیں ہوتا، نہ کوئی ضرر رساں چیز جانتے بوجھتے استعمال ہی کی جاتی ہے، بلکہ دھوکے سے یا غفلت سے موت واقع ہو جاتی ہے۔

لیکن فقہائے اسلام نے اس چوتھی قسم کا حکم بھی وہی قرار دیا ہے جو قرآن مجید میں قتل خطا کا حکم بیان فرمایا گیا ہے۔ یعنی اگر مقتول اسلامی حکومت کا شہری ہو تو قاتل کو کفارہ بھی دینا ہوگا اور خوں بہا بھی۔ کفارہ تو خود قرآن میں بتا دیا گیا ہے کہ وہ ایک مومن غلام کو آزاد کرنا، یا پے در پے دو مہینے کے روزے رکھنا ہے۔ رہا خونبہا تو اس کی کوئی مقدار قرآن میں نہیں بتائی گئی، مگر احادیث سے یہ بات بتواتر ثابت ہے کہ قتل خطا کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سَو اونٹ خونبہا مقرر فرما دیا تھا جن کی قیمت اُس زمانے میں دس ہزار درہم کے برابر تھی۔ (۱۰ ہزار درہم = ۲۲ سیر ۱۲½ چھٹانک چاندی)

یہ خوں بہا کا معاملہ اس لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ قرآن مجید میں اس کا حکم دیا گیا ہے اور صاف ارشاد ہوا ہے کہ اللہ سے قتلِ خطا کی معافی حاصل کرنے کے لیے کفارے کے ساتھ اس کا ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ اب اگر ہمارا ملکی قانون قتل خطا کی کوئی دوسری سزا دے، خواہ وہ قید ہو یا جرمانہ، تو یقیناً وہ اُس کفارے

اور تاوان کا بدل نہیں ہو سکتی جو آخرت میں ایک مسلمان کو خدا کے حضور بری الذمّہ کرنے کے لیے ضروری ہے اس لیے ہم ذرا وضاحت کے ساتھ خونبہا کے قاعدے کو یہاں بیان کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں کو اس سے ٹھیک ٹھیک واقفیت ہو جائے۔

۱- خونبہا ادا کرنے کی ذمہ داری شریعت نے صرف قاتل پر نہیں ڈالی ہے بلکہ اس کے "عاقلہ" کو اس کے ساتھ برابر کا شریک کیا ہے۔

۲- "عاقلہ" سے مراد، فقہائے حنفیہ کی تحقیق کے مطابق، ایک شخص کے اعوان و انصار ہیں۔ اگر وہ شخص کسی سرکاری محکمہ کا آدمی ہو، تو اس محکمے کے تمام ملازم اس کے عاقلہ ہیں۔ اگر کسی قبیلے یا برادری کا آدمی ہو، تو پورا قبیلہ یا برادری عاقلہ ہے۔ اگر کسی پیشہ ور گروہ کا آدمی ہو تو اس پیشے یا کارخانے کے سب لوگ عاقلہ ہیں۔ ورنہ بدرجۂ آخر، خزانۂ سرکار اس کی دیت ادا کرے گا۔

۳- عاقلہ پر قتلِ خطا کی دیت کا یہ بار اس لیے نہیں ڈالا گیا ہے کہ ایک شخص کے گناہ کی سزا سب کو دی جائے، بلکہ اس لیے ڈالا گیا ہے کہ ایک بھائی پر اچانک جو بارِ گناہ آپڑا ہے، اس کی ذمہ داری ادا کرنے میں اُس سے قریبی تعلق رکھنے والے سب لوگ اس کا ہاتھ بٹائیں، اور تنہا اُس پر اتنا بوجھ نہ پڑ جائے کہ اُس کی کمر توڑ دے۔ نیز جس خاندان کو اس کی غلطی کی وجہ سے جانی نقصان اٹھانا پڑا ہے اُس کی تلافی بھی آسانی سے ہو جائے۔ یہ ایک طرح کا صدقہ یا فی سبیل اللہ چندہ ہے جو ہر اُس شخص کی مدد کے لیے اُس کے وسیع حلقۂ اقارب سے حاصل کیا جاتا ہے جس سے کوئی مہلک غلطی سرزد ہو جائے۔ ہم اِس کو اخلاقی انشورنس سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

۴- عاقلہ سے پورا خون بہا یک وقت وصول نہیں کیا جائے گا بلکہ تین سال کی مدت میں تھوڑا تھوڑا کر کے لیا جائے گا۔ اگر عاقلہ کی وسعت کو پیشِ نظر رکھا جائے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فی کس دو تین آنے ماہوار سے زیادہ چندے کا بار کسی شخص پر نہیں پڑ سکتا۔

۵- یہ چندہ صرف مردوں سے لیا جائے گا۔ عاقلہ میں عورتیں شامل نہیں ہیں۔

۶- خونبہا لینے کے حق دار مقتول کے وارث ہوتے ہیں۔ جس قاعدے سے میراث تقسیم ہوتی ہے

اسی قاعدے سے یہ رقم بھی وارثوں میں تقسیم کی جائے گی۔

۷۔ مقتول کے وارث ہی خونبہا معاف کرنے کے حق دار ہیں، اور یہ معافی قرآن کی زبان میں ان کی طرف سے قاتل پر صدقہ ہے۔

اِن احکام پر اگر کوئی شخص غور کرے تو وہ بلا تامل یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ یہ طریقہ اخلاقی و تمدنی حیثیت سے موجودہ ملکی قانون کی بہ نسبت زیادہ افضل ہے۔ اس میں ایک طرف ۶۰ روزوں کا کفارہ اُس شخص کے دل کو پاک کرتا ہے جس کی غفلت یا غلطی سے ایک جان ضائع ہوئی۔ دوسری طرف یہی کفارہ آس پاس کے سب لوگوں کو چوکنّا کر دیتا ہے تاکہ وہ ایسی غلطیوں اور غفلتوں میں مبتلا ہونے سے بچیں۔ اس میں ایک طرف خونبہا ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ اُس خاندان کے آنسو پونچھے جائیں جس کا ایک فرد قاتل کی غلطی کا شکار ہوا ہے۔ دوسری طرف اس خونبہا کا بار عاقلہ پر ڈال کر اس کی ادائی کو آسان بنا دیا گیا ہے۔ پھر یہ ادائے دیت کی مشترک ذمہ داری ایک طرف عاقلہ کو چوکنّا کرتی ہے کہ وہ اپنے افراد کی نگرانی کریں، تو دوسری طرف یہ ہر ہر فرد میں یہ احساس بھی پیدا کرتی ہے کہ وہ ایک ہمدرد اور شریکِ رنج و راحت برادری سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ ایسی برادری سے جس میں "کسے را باکسے کارے نباشد"۔

عورت اور سفرِ حج

سوال: عورت کے محرم کے بغیر حج پر جانے کے بارے میں علمائے کرام کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے۔ آپ براہِ کرم مختلف مذاہب کی تفصیل سے آگاہ فرمائیں اور یہ بھی بتائیں کہ آپ کے نزدیک قابلِ ترجیح مسلک کونسا ہے؟

جواب: عورت کے بلا محرم حج کرنے کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ اس معاملہ میں چار مسلک پائے جاتے ہیں جنہیں مختصراً یہاں بیان کیے دیتا ہوں:۔

(۱) عورت کو کسی حال میں شوہر یا محرم کے بغیر حج نہ کرنا چاہیے۔ یہ مسلک ابراہیم نخعی، طاؤس، شعبی اور

حسن بصری رحمہم اللہ سے منقول ہے اور حنبلی مذہب کا یہی فتویٰ ہے۔

(۲) اگر حج کا سفر تین شبانہ روز سے کم کا ہو تو عورت بلا محرم جا سکتی ہے، لیکن اگر تین دن یا اس سے زائد کا سفر ہو تو شوہر یا محرم کے بغیر نہیں جا سکتی۔ امام ابو حنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ کا یہی مذہب ہے۔

(۳) جو عورت شوہر یا محرم نہ رکھتی ہو وہ ایسے لوگوں کے ساتھ جا سکتی ہے جن کی اخلاقی حالت قابلِ اطمینان ہو۔ یہ ابن سیرین، عطاء، زہری، قتادہ اور اوزاعی رحمہم اللہ کا مسلک ہے اور امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔ امام شافعیؒ نے "قابلِ اطمینان رفیقوں" کی مزید تشریح اس طرح کی ہے کہ اگر چند عورتیں بھروسے کے قابل ہوں اور وہ اپنے محرموں کے ساتھ جا رہی ہوں تو ایک بے شوہر اور بے محرم عورت اُن کے ساتھ جا سکتی ہے۔ البتہ صرف ایک عورت کے ساتھ اُسے نہ جانا چاہیے۔

(۴) ان سب کے خلاف ابنِ حزمؒ ظاہری کا مسلک یہ ہے کہ بے محرم عورت کو تنہا ہی حج کے لیے جانا چاہیے۔ اگر وہ شوہر رکھتی ہو اور وہ اسے نہ لے جائے تو شوہر گنہ گار ہو گا مگر عورت کے لیے جائز ہے کہ وہ اس کے بغیر حج کو چلی جائے۔

میں ان چاروں مسالک میں سے تیسرے مسلک کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ اس میں ایک دینی فریضہ کو ادا کرنے کی گنجائش بھی ہے، اور اُس فتنے کا احتمال بھی نہیں ہے جس کی وجہ سے حدیث میں عورت کے بلا محرم سفر کرنے کو منع کیا گیا ہے۔

اَخیافی بھائی بہنوں کا حصۂ وراثت

سوال: ۔ قدوری (کتاب الفرائض، باب الحجب) میں یہ عبارت درج ہے: اِنْ تَرَکَتِ الْمَرْأَۃُ زَوْجًا وَّ اُمًّا اَوْ جَدَّۃً وَّ اِخْوَۃً مِّنْ اُمٍّ وَّ اَخًا مِّنْ اَبٍ وَّ اُمٍّ فَلِلزَّوْجِ النِّصْفُ وَلِلْاُمِّ السُّدُسُ وَلِاَوْلَادِ الْاُمِّ الثُّلُثُ وَلَا شَیْءَ لِلْاِخْوَۃِ لِلْاَبِ وَالْاُمِّ "یعنی اگر ایک عورت کے وارثوں میں اُس کا شوہر اور ماں یا دادی اور اخیافی (ماں شریک) بھائی اور سگا بھائی

موجود ہوں تو شوہر کو آدھا حصہ، ماں کو چھٹا حصہ اور اخیافی بھائی بہنوں کو ایک تہائی حصہ ملے گا، اور سگے بھائیوں کو کچھ نہ ملے گا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا یہ احناف کا مفتیٰ بہ قول ہے؟ کیا یہ قرینِ انصاف ہے کہ برادرِ حقیقی تو محروم ہو جائے اور اخیافی بھائی وارث قرار پائے؟ بلفظ و کلالہ کی قانونی تعریف بھی واضح فرمائیں۔ کیا والدہ اور دادی کے زندہ ہونے کے باوجود بھی ایک میت کو کلالہ قرار دیا جا سکتا ہے؟

جواب: قدوری سے جو مسئلہ آپ نے نقل کیا ہے، اس میں سلف کے مابین اختلاف ہے۔ اگر کوئی عورت مر جائے اور پیچھے شوہر، ماں، سگے بھائی بہن اور اخیافی (یعنی ماں جائے) بھائی بہن چھوڑے تو حضرت علیؓ، ابو موسیٰ اشعری اور اُبَیّ ابن کعب رضی اللہ عنہم کا فتویٰ یہ ہے کہ اُس کی نصف میراث شوہر کو، ⅙ ماں کو اور ⅓ اخیافی بھائی بہنوں کو دیا جائے گا اور سگے بھائی بہنوں کو کچھ نہ ملے گا۔ اسی فتوے کو علمائے احناف نے لیا ہے اور یہی اُن کا مفتیٰ بہ قول ہے۔ بخلاف اس کے حضرت عثمانؓ اور حضرت زیدؓ بن ثابت کا مذہب یہ ہے کہ ⅓ میراث سگے اور اخیافی بھائی بہنوں میں برابر تقسیم کی جائے گی۔ حضرت عمرؓ پہلے قولِ اول کے قائل تھے، مگر بعد میں انہوں نے بھی قولِ ثانی کو اختیار کر لیا۔ ابن عباسؓ سے دو روایتیں مروی ہیں، مگر زیادہ معتبر روایت یہی ہے کہ وہ بھی قولِ ثانی کے قائل تھے۔ اسی پر قاضی شُریح نے فیصلہ کیا ہے اور امام شافعی، امام مالک اور سفیان ثَوری رحمہم اللہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ حنفیہ کا استدلال یہ ہے کہ اخیافی بھائی بہن ذوی الفروض ہیں اور سگے بھائی عصبات ہیں، اور ذوی الفروض کا حق عصبات پر مقدم ہے، لہٰذا جب ذوی الفروض سے کچھ نہ بچے تو عصبات کو کوئی حق نہ پہنچے گا۔ دوسرے گروہ کا استدلال یہ ہے کہ ماں جائے ہونے میں جب سگے اور اخیافی بھائی بہن یکساں ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ برابر کے حصے دار نہ ہوں۔

کلالہ کے جو معنی حضرت ابو بکرؓ نے بیان فرمائے ہیں اور جنہیں حضرت عمرؓ نے بھی قبول کیا ہے وہ یہ ہیں مَنْ لَّا وَلَدَ لَهٗ وَلَا وَالِدَ۔ یعنی کلالہ وہ ہے جس کی نہ اولاد ہو اور نہ باپ۔ اس طرح ماں یا دادی کی موجودگی کسی میت کے کلالہ ہونے میں مانع نہیں ہے۔

مسئلہ تقدیر

سوال:۔ مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر میں ذیل کی متفق علیہ حدیث وارد ہے:۔

.... اِنَّ خَلْقَ اَحَدِکُمْ یُجْمَعُ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ .... ثُمَّ یَبْعَثُ اللّٰہُ اِلَیْہِ مَلَکًا بِاَرْبَعِ کَلِمَاتٍ فَیَکْتُبُ عَمَلَہٗ وَاَجَلَہٗ وَرِزْقَہٗ وَشَقِیٌّ اَوْسَعِیْدٌ ثُمَّ یُنْفَخُ فِیْہِ الرُّوْحَ .... (یقیناً تم میں سے ہر ایک کی تخلیق اُس کی ماں کے پیٹ میں ہوتی ہے .... پھر اللہ تعالیٰ اُس کی طرف ایک فرشتے کو چار باتیں دے کر بھیجتا ہے، چنانچہ وہ اس کے عمل، عمر، رزق اور شقاوت وسعادت کے بارے میں نوشتہ تیار کر دیتا ہے اور پھر اس میں روح پھونک دیتا ہے)۔ اب سوال ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان سارے معاملات کا فیصلہ ماں کے پیٹ میں ہی ہو جاتا ہے۔ تو پھر آزادیٔ عمل اور ذمہ داریٔ عمل کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟ عام طور پر لوگ ایسی ہی احادیث سن لینے کے بعد ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہتے ہیں۔

جواب:۔ تقدیر کے مسئلے میں آپ کو جو اُلجھن ہے اسے چند لفظوں میں دُور کرنا مشکل ہے۔ آپ اگر پوری طرح سمجھنا چاہیں تو میری کتاب "مسئلہ جبر و قدر" ملاحظہ فرمائیے۔

حدیث کے بارے میں یہ بات آپ کے ذہن نشین رہنی چاہیے کہ کسی مسئلے کے سارے پہلو کسی ایک ہی حدیث میں مذکور نہیں ہوتے، اس لیے جو شخص صرف ایک دو روایتوں کو لے کر ان سے کوئی نتیجہ نکالنا چاہے گا وہ غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جائے گا۔ جو اُلجھن آپ کو ایک حدیث سے پیش آئی ہے اس سے بہت زیادہ اُلجھنیں اس صورت میں پیش آئیں گی جبکہ قرآن کی کسی ایک آیت سے آپ کوئی بڑا مسئلہ حل کرنا چاہیں گے اسی مسئلہ تقدیر کے متعلق قرآن مجید کی کوئی آیت سراسر جبر کا پہلو پیش کرتی ہے اور کوئی دوسری آیت انسانی اختیار کی اہمیت ظاہر کرتی ہے۔ جبر اور اختیار، دونوں ہی بیک وقت انسانی زندگی کے ہر گوشے میں اس طرح پائے جاتے ہیں کہ اگر مجرد ایک کو الگ کر کے دیکھا جائے تو دوسرے کا کوئی مقام باقی رہتا نظر نہیں آتا، حالانکہ ایک کو دیکھنے کے ساتھ یہ ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ دوسری حقیقت کا

جو مقام ہے وہ بھی اپنی جگہ بحال رہے۔ مسئلہ تقدیر کی ہر وہ تعبیر جو حقیقت کے ایک رُخ کو دوسرے رُخ کی قطعی نفی کا ذریعہ بنا دے وہ کسی صورت میں بھی صحیح نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اہل علم مسائل دین کے متعلق ایک جامع نظریہ قائم کرنے کے لیے یہ ضروری قرار دیتے ہیں کہ ایک مسئلہ پر جتنی آیات اور احادیث سے روشنی پڑتی ہو ان سب کو نگاہ میں رکھا جائے۔

جس خاص حدیث کے بارے میں آپ نے اپنی الجھن بیان فرمائی ہے اس پر آپ اس پہلو سے غور فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ جو بے شمار مخلوق روزانہ پیدا فرما رہا ہے اگر اس کو ان میں سے ہر ہر چیز کے متعلق یہ معلوم نہ ہو کہ کس چیز کی کیا استعداد ہے، کس کا دنیا میں کیا کام ہے، اور کس کو نظامِ کائنات میں کس جگہ رہنا ہے اور کیا خدمت سرانجام دینی ہے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ (معاذ اللہ) اس بے خبری کے ساتھ ایک دن بھی اس عظیم الشان کائنات کا انتظام چلا سکتا ہے؟ یہ بات آخر کس طرح باور کی جا سکتی ہے کہ دنیا کا خالق اور مدبر اپنی مخلوق کے حال اور مستقبل سے لاعلم ہو؟ یہ تک نہ جانتا ہو کہ کل اس کی سلطنت میں کیا کچھ پیش آنے والا ہے اور اس کو کسی کے اچھے یا بُرے ارادے کا صرف اُسی وقت علم ہو جب وہ اپنا کام کر گذرے! یہ بات نہ صرف خلافِ عقل ہے بلکہ اگر آپ اس کے نتائج پر غور کریں تو اُن الجھنوں سے بہت زیادہ سخت الجھنیں اس سے پیدا ہوتی ہیں جو پیشگی نوشتۂ تقدیر کی خبر سُن کر آپ کے ذہن میں پیدا ہوئی ہیں۔ پس یہ تو بہر حال ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ جملہ ما کان وما یکون کا علم رکھتا ہے اور ہر متنفس کا مستقبل اسے معلوم ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ اللہ کے اس علمِ سابق نے ہر متنفس کو وہی کام کرنے پر مجبور بھی کر دیا ہے جو اللہ کو معلوم ہے۔ اللہ کا علم اللہ کی قدرت کی نفی نہیں کرتا۔ اللہ کی قدرت نے ہر انسان کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ بھلائی اور برائی میں سے جس چیز کو چاہے انتخاب کرے، اور اللہ کا علم یہ جانتا ہے کہ کون شخص کیا کچھ انتخاب کریگا۔ غلطی سے اُس ذاتِ پاک کا علم منزہ ہے اور عجز سے اس کی قدرت منزہ۔

رہی یہ بات کہ لوگ عقیدۂ تقدیر کو غلط معنی میں لے رہے ہیں اور اس کے برے نتائج نکل رہے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ایک حقیقت کو اس کی وجہ سے بدل ڈالا جائے۔ نہ حقیقتیں

اس بنیاد پر بدل سکتی ہیں کہ لوگ ان کے سمجھنے میں غلطی کر رہے ہیں غلطی حقیقت کی نہیں بلکہ لوگوں کی سمجھ کی ہے اور وہی اصلاح طلب ہے۔

حُروفِ مقطّعات

سوال :۔ تفہیم القرآن، میں آپ نے حروف مقطعات کی بحث میں لکھا ہے کہ دورِ نزولِ قرآن میں الفاظ کے قائم مقام ایسے حروف کا استعمال حُسنِ بیان اور بلاغتِ زبان کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ نیز یہ کہ ان کے معنی و مفہوم بالکل معروف ہوتے تھے یہی وجہ ہے کہ مخالفینِ اسلام کی طرف سے اُس وقت ان کے استعمال پر کبھی اعتراض نہیں ہُوا تھا۔ آگے چل کر آپ فرماتے ہیں کہ ان حروف کی تشریح چنداں اہمیت نہیں رکھتی اور نہ ان کے سمجھنے پر ہدایت کا انحصار ہے۔ اس بارے میں میری حسبِ ذیل گذارشات ہیں :۔

اگر ان حروف کے معانی ابتدائی دَور میں ایسے معروف تھے تو یہ کیونکر ممکن ہُوا کہ ان کا استعمال شعر و ادب میں متروک ہو گیا اور دفعتہً ان کے معانی اذہان سے کلیتہً محو ہو گئے۔ اس کا تو یہ مطلب ہُوا کہ اگر آج بلادِ عربیہ میں چند ایسے الفاظ کا استعمال متروک ہو جائے جو قرآن میں بھی آتے ہیں تو کچھ عرصہ کے بعد دنیائے اسلام میں قرآن کے ان الفاظ کا صحیح مفہوم متعین نہیں رہے گا۔ پھر اس سے بھی عجیب تر آپ کا یہ استدلال ہے کہ چونکہ ان حروف کے معانی کے تعین پر ہدایت و نجات کا مدار نہیں اس لیے ان کی تشریح و توضیح کی مطلق ضرورت نہیں۔ اس طرح تو قرآن کے بیشتر حصے کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ اُس کا مطلب سمجھنے پر ہدایت کا انحصار نہیں اور اُس حصے کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اس نظریے کے تحت تو تجدد پسند حضرات سے کچھ بعید نہیں کہ وہ قرآن کے ایک حصے کو اہمیت دیں اور دوسرے حصے سے صرفِ نظر کریں۔ براہ کرم آپ اپنے موقف کی دوبارہ وضاحت فرمائیں۔

جواب:- آپ نے جو اعتراضات کیے ہیں، ان سے پہلے اگر آپ اُن بحثوں کو پڑھ لیتے جو قدیم ترین تفسیروں سے لے کر آج تک کی تفسیروں میں حروفِ مقطعات پر کی گئی ہیں تو آپ کو میری بات سمجھنے میں زیادہ سہولت ہوتی، بلکہ شاید اُن بحثوں کے دیکھنے کے بعد آپ محسوس کرتے کہ اس مسئلے میں سب سے زیادہ اطمینان بخش بات وہی ہو سکتی ہے جو میں نے لکھی ہے۔

کسی زبان میں بعض اسالیبِ بیان کا متروک ہو جانا یا معروف نہ رہنا کوئی ایسا انوکھا واقعہ نہیں ہے کہ آپ کو یہ بات سن کر اس قدر تعجب ہوا۔ بلکہ اس کے برعکس یہ ایک عجیب بات ہے کہ قرآن کی بدولت تیرہ سو برس سے عربی زبان کے ادب میں اتنا کم تغیر واقع ہوا ہے، ورنہ اتنی طویل مدت میں تو زبانیں بدل کر کچھ سے کچھ ہو جایا کرتی ہیں۔ حروفِ مقطعات زیادہ تر خطابت اور شعر میں استعمال ہوتے تھے، اور ان کے کوئی ایسے متعین معنی نہ تھے کہ باقاعدہ لغت میں وہ درج کیے جاتے، بلکہ یہ ایک اسلوبِ بیان تھا جس سے کثرتِ استعمال کی بنا پر بولنے والے اور سننے والے یکساں طور پر مانوس تھے۔ اسی لیے جب رفتہ رفتہ زبان میں یہ اسلوب کم استعمال ہوتے ہوتے متروک ہو گیا تو لوگوں کے لیے اس کا سمجھنا مشکل ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ تیسری چوتھی صدی کے مفسرین کو ان کے معنی متعین کرنے کے لیے لمبی چوڑی بحثیں کرنی پڑیں اور پھر بھی کوئی تشفی بخش بات نہ کہہ سکے۔ اسالیبِ بیان کے بتدریج متروک ہونے کی شان یہی ہوتی ہے کہ کوئی خاص تاریخ ان کے متروک ہونے کی بیان نہیں کی جا سکتی۔ بس ایک مدت کے بعد محسوس ہونے لگتا ہے کہ لوگ اُن کو سمجھنے سے قاصر ہو رہے ہیں۔ جس زمانے میں یہ اسلوب مستعمل تھا اُس زمانے میں اس کی تشریح کی کسی کو ضرورت نہ پیش آئی اور جب یہ مستعمل نہ رہا تو تشریح کی ضرورت بھی پیش آئی اور تشریحات کی بھی گئیں، مگر جیسا کہ میں اُوپر کہہ چکا ہوں یہ تشریحات اتنی مختلف تھیں کہ ان میں سے کوئی بھی تشفی بخش نہ ہو سکی۔

آپ کا یہ شبہ بھی صحیح نہیں ہے کہ اگر قرآن کے بعض الفاظ متروک الاستعمال ہو جائیں تو کیا ان کا مفہوم بھی متعین نہ رہے گا؟ الفاظ اور اسالیبِ بیان کو خلط ملط نہ کیجیے۔ الفاظ کے سارے مادے لغت میں ضبط کیے جا چکے ہیں اور ان کی جملہ مشتقات، نیز محاورے میں ان کے استعمالات، سب کو اہلِ لغت نے

وضاحت کے ساتھ لکھ دیا ہے۔ اس لیے اب اگر عربی زبان میں ان کا استعمال عموماً نہ ہو تب بھی کوئی نقصان واقع نہیں ہوتا۔ مگر اسالیبِ بیان کا معاملہ بہت مختلف ہے۔ ان کے معانی کہیں ضبط کیے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ استعمال سے ہی سمجھ میں آتے ہیں، اور استعمال ترک ہونے کے بعد کسی حد تک وہی لوگ اُن کو سمجھ سکتے ہیں جو اُس دَور کے ادب کا کثرت سے مطالعہ کریں جس دَور میں وہ اسالیب مستعمل تھے یہاں تک کہ ان کا ذوق اُن اسالیب سے مانوس ہو جائے۔

مَیں نے حروفِ مقطعات کے متعلق یہ جو بات کہی ہے کہ ان کا مفہوم نہ سمجھنے سے کوئی بڑی قباحت واقع نہیں ہوتی، اسے آپ خواہ مخواہ کھینچ کر بہت دُور لے گئے ہیں۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ حروف چونکہ خطیبانہ بلاغت کی شان رکھتے ہیں، اور ان میں کوئی خاص حکم یا کوئی خاص تعلیم ارشاد نہیں ہوئی ہے، اس لیے اگر آدمی ان کا مطلب نہ سمجھ سکے تو اُس کا یہ نقصان نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کو جاننے سے یا کسی تعلیم کا فائدہ اٹھانے سے محروم رہ گیا۔ لہٰذا جب ان کے معنی متعین کرنے کے لیے کوئی اصل ہاتھ نہیں آتا، اور کوئی مستند تشریح بھی نہیں ملتی، تو خواہ مخواہ تکلف سے معنی پیدا کرنے اور تیر تکے لڑانے کی ضرورت نہیں۔ ان کی صحیح مراد خدا پر چھوڑ دیجیے اور کتاب کی اُن آیات پر تدبّر شروع کر دیجیے جنہیں سمجھنے کے ذرائع ہمارے پاس ہیں۔

سر کے بالوں کا جواز و عدم جواز

سوال: آپ نے بعض استفسارات کے جواب میں فرمایا ہے کہ انگریزی طرز کے بالوں کو سر پر رکھنا آپ پسند نہیں کرتے، کیونکہ یہ غیر مسلم اقوام کی وضع ہے، تاہم آپ شرعاً اسے قابلِ اعتراض بھی نہیں سمجھتے۔ لیکن بعض علماء اس وضع کو ناجائز خیال کرتے ہیں۔ آپ اگر ترجمان میں اپنی تحقیق کی وضاحت کر دیں تو دوسرے لوگ بھی مستفید ہو سکیں گے۔

جواب: سر کے بالوں کے متعلق شریعت کا حکم اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ حدیث میں "قزع"

کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ قزع کچھ بال مونڈنے اور کچھ رکھنے کو کہتے ہیں۔ یہی چیز ممنوع بالذات ہے اور اسی سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ باقی رہیں دوسری وضعیں تو ان میں سے کسی کے عدم جواز کا ثبوت نہیں ہے، اس لیے وہ سب جائز ہیں، خواہ کوئی سارا سر مونڈ دے، یا سارے سر کے بال کتروالے، یا کچھ کتروائے اور کچھ رکھے، یا نصف کان تک رکھے، یا کان کی لَو تک رکھے یا اس سے بھی نیچے تک یہ سب اس لیے جائز ہیں کہ اصولاً جو کچھ ممنوع نہیں ہے وہ مباح ہے۔

بعض لوگ کچھ کترنے اور کچھ رکھنے کو بھی قزع کی تعریف میں لاتے ہیں، مگر یہ نہ اس لفظ کا صریح مدلول ہے اور نہ شارع نے بعینہٖ اس چیز کو منع کیا تھا۔ اصل ممنوع کچھ مونڈنا اور کچھ رکھنا ہے نہ کہ کچھ کترونا اور کچھ رکھنا۔ اگر ایک شخص ایک کو دوسرے پر قیاس کر کے ممنوع سمجھے، تو اپنے قیاس پر اسے خود ہی عمل کرنا چاہیے، یا پھر اس شخص کو جو اس کے قیاس کی صحت کا قائل ہو۔ دوسرے کسی شخص کو، جو اس قیاس سے متفق نہ ہو، وہ نہ مجبور کر سکتا ہے کہ وہ اس کا قیاس تسلیم کرے، اور نہ اس بنا پر گنہ گار ٹھہرا سکتا ہے کہ اس نے حکم رسول کے اس معنی کی پیروی کیوں نہ کی جو میں نے اپنے قیاس واستنباط سے بیان کیے تھے۔

بعض لوگ اس نوعیت کے بالوں کو تشبہ کی تعریف میں لاتے ہیں، مگر وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ تشبہ جس سے شارع نے منع فرمایا ہے، صرف اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ ایک شخص بحیثیت مجموعی اپنی وضع قطع کافروں کے مانند بنالے۔ غیر مسلموں کے فیشن، لباس، اوضاع میں سے بعض اجزاء کو لے لینا تشبہ کی تعریف میں نہیں آتا۔ ورنہ آخر اس بات کی کیا توجیہ کی جائے گی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود رومی جُبّہ پہنا ہے، کسروانی قبا پہنی ہے، شلوار کو پسند کر کے خریدا ہے جو ایران سے عرب میں نئی نئی پہنچی تھی اور حضرت عمرؓ نے بُرنس پہنی ہے جو مسیحی درویش پہنا کرتے تھے۔ لہٰذا جزوی تشبہ کی بنا پر کسی کو گنہ گار ٹھہرانا یا فاسق قرار دینا زیادتی ہے۔ البتہ اگر بالوں کی یہ وضع بھی اسی طرح ممنوع ہوتی جس طرح بڑی بڑی مونچھوں کو مجوس کی وضع کہہ کر منع کر دیا گیا تھا، تو البتہ اس طرح کے بال کتروانے کو گناہ قرار دیا جا سکتا تھا۔

یہاں میں یہ تصریح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں اصولاً اس بات کا قائل ہوں، اور اس اصول پر مجھے شدت کے ساتھ اصرار ہے کہ آدمی صرف حکمِ منصوص کی خلاف ورزی سے ہی گنہ گار قرار پا سکتا ہے، قیاس

واستنباط سے نکالے ہوئے احکام کی خلاف ورزی کسی کو گنہ گار نہیں بناتی، بجز اُس شخص کے جو اُس قیاس واستنباط کا قائل ہو۔ اسی طرح مجھے اس بات پر بھی اصرار ہے کہ حرام صرف وہ ہے جسے خدا اور رسول نے بالفاظ صریح حرام کہا ہو، یا جس سے صاف الفاظ میں منع کیا ہو، یا جس میں مبتلا ہونے والے کو سزا کی وعید سنائی ہو، یا نصوص کے اشارات و اقتضاءات سے جن کی حرمت مستنبط ہونے پر اجماع ہو۔ رہیں وہ چیزیں جو قیاس و اجتہاد سے حرام ٹھہرائی گئی ہوں اور جن میں دلائلِ شرعیہ کی بنا پر دو یا دو سے زیادہ اقوال کی گنجائش ہو، تو وہ مطلقاً حرام نہیں ہیں، بلکہ صرف اُس شخص کے لیے حرام ہیں جو اس قیاس و اجتہاد کو صحیح تسلیم کرے۔ میرے نزدیک اس حقیقت سے اغماض برتنا اُن اہم اسباب میں سے ایک ہے جن کی بنا پر امت کے مختلف گروہوں نے ایک دوسرے کی تضلیل و تفسیق کی ہے۔

ترجمان القرآن

ترجمان القرآن کی جلد ۱، ۲، ۳، ۶، ۷، ۸، ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۳، ۱۵، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۴ کے متفرق پرچے رباط العلوم الاسلامیہ ۱۰/۱ فریئر روڈ کراچی کو اپنے ریکارڈ کے لیے مطلوب ہیں۔ یہ ایک لائبریری ہے جہاں ہر شخص مفت مطالعہ کر سکتا ہے۔ پاکستان یا ہندوستان میں جو صاحب مذکورہ بالا جلدوں کے متفرق پرچے قیمتاً دینا چاہتے ہوں وہ ادارۂ مذکورہ سے براہِ راست خط و کتابت فرمائیں۔

"المسلمون"

جو اخوان المسلمون کا آرگن ہے اور جس پر ترجمان رمضان و شوال ۸۱ھ کے ص ۱۰۵ پر تبصرہ ہو چکا ہے، پاکستان میں اس کا سالانہ چندہ دس روپے نور محمد، کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ کراچی کے پتے پر بھیج کر سال بھر کے لیے رسالہ باقاعدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ نمونے کا پرچہ بھی ایک روپے میں طلب کیا جا سکتا ہے۔

مطبوعات

الاخوان المسلمون اور ان کی دعوت | تقریر حسن البنا شہید رحمۃ اللہ علیہ۔ ترجمہ از طٰہٰ یٰسین۔ رفیق دار العروبہ راولپنڈی۔ شائع کردہ: مکتبہ چراغ راہ - ۹ - لوٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ کراچی قیمت ایک روپیہ چار آنے

تجدید و احیائے اسلام کی جو روح مسلمانانِ عالم کی نئی نسل میں تقلیدِ مغرب کے تلخ تجربات کے بعد اُبھر رہی ہے، عربی ممالک میں اس کی مظہر مشہور دینی تنظیم "الاخوان المسلمون" ہے۔ اس تنظیم کے داعی حسن البنا شہیدؒ نے یہ تقریر اس کی تاسیس کے دس سال بعد ۱۹۳۶ء میں اس کے پانچویں کھلے اجلاس کے موقع پر کی تھی۔ جماعت "الاخوان المسلمون" اگرچہ آج اس مرحلے سے بہت آگے نکل آئی ہے جس میں وہ اس تقریر کے زمانے میں تھی لیکن یہ تقریر اپنی اصولیت، اپنی جامعیت اور اپنی روحانیت کی وجہ سے آج بھی اس کے لیے مشعلِ راہ ہے اس میں اس تحریک کے اصول و منہاج کو داعی شہیدؒ نے کھول کر پیش کر دیا ہے جس کے لیے اخوان کو جمع کیا گیا تھا۔ اس میں وقت کے بہت سے سوالات اور شکوک و شبہات کا جواب بھی دیا گیا ہے۔ اخوان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ "اسلام دراصل وہی اسلام ہے جو زندگی کے سارے شعبوں اور اس کے تمام مسائل کو محیط ہو۔" (ص۲۳) اور "تمام اسلامی تعلیمات کی اساس اور اس کا سرچشمہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہے" (ص۲۴) تحریک اخوان کی جامعیت یوں واضح کی ہے کہ: "الاخوان المسلمون ایک سلفی دعوت ہے"۔ "الاخوان المسلمون ایک طریقۂ سنت ہے"۔ "الاخوان المسلمون ایک حقیقتِ تصوف ہے"۔ "الاخوان المسلمون ایک سیاسی جماعت ہے"۔ "الاخوان المسلمون ایک عسکری تنظیم ہے"۔ "الاخوان المسلمون ایک علمی و ثقافتی انجمن ہے"۔ "الاخوان المسلمون ایک معاشی ادارہ ہے"۔ اور "الاخوان المسلمون ایک اجتماعی فکر ہے" (ص۲۵ تا ص۳۰)۔ پھر اس تقریر میں بتایا گیا ہے کہ اخوان کی دعوت فقہی اختلافات سے دوری، اکابر اور اربابِ جاہ سے بے نیازی، سیاسی جماعتوں اور انجمنوں سے اجتناب، ٹھوس تعمیری اور تدریجی طریقِ عمل، اشتہار و اعلان کے بجائے خاموش عملی کام جیسے امتیازات کی حامل ہے (ص۳۱)۔ یہ وضاحت بھی کی گئی ہے کہ اگرچہ اخوان خدمتِ دین کے

لیے قوت کو ضروری سمجھتے ہیں، لیکن "جہاں تک متشددانہ انقلاب کا تعلق ہے، الاخوان اس کے بارے میں کچھ سوچنا ہی نہیں چاہتے" (ص ۶۴) پھر یہ بات صاف صاف سنا دی گئی ہے کہ "یہاں تو یہ حال ہے کہ اسلامی قوانین حوالۂ طاقِ نسیان ہیں اور مروجہ قوانین کو ان سے کوئی علاقہ ہی نہیں۔ ان حالات میں مصلحین اسلام کا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا اور حکومت و اقتدار کے لیے کوئی اقدام نہ کرنا صریح اسلامی جرم ہے۔ اس جرم کے داغ کو دھونے کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ اٹھیں، آگے بڑھیں اور اقتدار کی باگ ان اسلام سے برگشتہ عناصر سے چھین لیں۔" (ص ۶۶)

تقریر سادہ اور روحانی جذبات سے لبریز ہے۔ ترجمہ خاصا ہے۔ صرف ایک مقام پر ایک چیز کھٹکی کہ الاخوان کی دعوت کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ وہ "ایمان والوں کے دلوں میں پہلے ایک حقیر تخم بن کر داخل ہوئی . . . ." (ص ۵۲) اس جگہ تخم کی چھوٹائی کو حقیر کے لفظ سے بیان کرنا نامناسب ہے کیونکہ تخم تو آخر اسلامی دعوت ہی کا ہے، وہ حقیر کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کے بجائے "ذرا سا" کہنا چاہیے تھا۔

یہ تقریر پاکستان کے لوگوں کو مصر (بلکہ عربستان) کی تحریکِ اسلامی کو سمجھنے میں مدد دے سکتی ہے۔

مکاتیبِ زنداں | مرتبہ: حکیم محمد شریف صاحب امرتسری، مقیم حافظ آباد۔ شائع کردہ: مکتبہ "چراغِ راہ" کراچی، قیمت: مجلد مع گرد پوش دو روپے۔

یہ مجموعہ ہے پاکستان کی تحریکِ اسلامی کے تین نظر بندوں (۱۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی امیرِ جماعت اسلامی، ۲۔ مولانا امین احسن اصلاحی، ۳۔ میاں طفیل محمد قیّمِ جماعت اسلامی) کے اُن خطوط کا جو زمانۂ نظر بندی (۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء تا ۲۸ مئی ۱۹۵۰ء) میں ان حضرات نے وقتاً فوقتاً اپنے اعزہ و احباب کو لکھے تھے۔ بقولِ مرتب اِن خطوط میں "بعض دینی مسائل بھی ہیں، اپنی کیفیات کا بیان بھی ہے اور جیل سے باہر رہنے والوں کے لیے حرفِ تسلّی بھی" اور "ان خطوط کے آئینے میں تینوں حضرات کا باطن خوب نمایاں ہے" نیز یہ بھی کہ ". . . . یہ خطوط ایک ادبی خزانہ بھی بن گئے ہیں"۔

اِس مجموعۂ خطوط کے آغاز میں تینوں حضرات کا مجمل تعارف درج ہے، اس کے بعد "گرفتاری کا پس منظر" کے زیرِ عنوان مرتب کے قلم نے گویا اس وقت کی تاریخ کو الفاظ میں ہمیشہ کے لیے نظر بند کر دیا ہے۔ پھر

"گرفتاری سے رہائی تک" کی داستان کو میاں طفیل محمد صاحب نے اس خوبی سے قلمبند کیا ہے کہ پڑھنے والا بھی ملتان جیل کی گویا سیر سی کر آتا ہے۔ ان چیزوں کے شامل ہونے کی وجہ سے کتاب میں باقاعدہ "کتاب پن" پیدا ہو گیا ہے!

طباعتی محاسن کا معیار اعلیٰ ہے، مگر افسوس ہے کہ بعض بہت ہی نمایاں قسم کی غلطیاں رہ گئیں اور تصیح کا کام کما حقہٗ نہیں کیا گیا۔

قرآن اور حقیقتِ شرک | از جناب حافظ محمد سرور صاحب کوہاٹی۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جماعت اسلامیہ ۱۰۷/۱ بی، خداداد کالونی، کراچی ۵۔ قیمت مجلد پانچ روپے آٹھ آنے۔

یہ کتاب کوہاٹ کی "جماعت اسلامیہ" (نہ کہ "جماعتِ اسلامی") کی دعوت و فکر کی ترجمان ہے۔ جناب مؤلف نے اس دعوے کے ثبوت میں پورا زور صرف کیا ہے کہ تمام گناہوں کا سرچشمہ دراصل شرک ہے۔ دوسری بات جس پر استدلال کیا گیا ہے یہ ہے کہ موقف دو ہی ہیں، ایمان اور کفر یا توحید اور شرک۔ اب جس کسی میں کفر یا شرک کی کوئی بات پائی جائے گی، اہلِ ایمان و اہلِ توحید کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اسے کافر و مشرک قرار دیں۔ اس نقطۂ نظر کا اثر پوری کتاب میں پھیلا ہوا ہے یعنی داعیانہ دردمندی کی جگہ بگڑے ہوئے مسلمانوں کے لیے شدت و نفرت کے جذبات زیادہ نمایاں ہیں۔ مؤلف کے حسن نیت میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا، مگر تشدد ہمیشہ اصلاح میں مانع ہوا کرتا ہے۔

حقائق الاسلام (حصہ اول) | از جناب حافظ محمد سرور صاحب کوہاٹی۔ ملنے کا پتہ: دفتر جماعت اسلامیہ نزد محلہ جمعہ خان۔ شہر کوہاٹ۔ صوبہ سرحد۔ قیمت مجلد چار روپے۔

اس کتاب میں "جماعت اسلامیہ" کے اصول و قواعد اور اغراض و مقاصد کو پیش کیا گیا ہے اور اسلامی اعمال و اخلاق کی حقیقت ایک خاص نقطۂ نظر سے بیان کیا گیا ہے۔ نقطۂ نظر وہی ہے جو اوّل الذکر کتاب میں نمایاں ہے۔

PRAYER FOR PROGRESS | مؤلفہ: جناب عبدالرزاق صاحب بی۔ اے، شائع کردہ: شیخ محمد اشرف کشمیری بازار، لاہور۔ قیمت درج نہیں۔

مؤلف نے انگریزی زبان میں موجودہ دور کے ذہنی تقاضوں کو سامنے رکھ کر اسلامی نقطۂ نظر سے عبادت کی حقیقت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور ثابت یہ کرنا چاہا ہے کہ خدائے واحد سے عبادت کا رشتہ استوار کیے بغیر صحیح انسانی ارتقاء ممکن نہیں ہے۔ انداز بیان اور طرز استدلال میں نیا رنگ شامل ہے اور تحریر کے پس منظر میں اچھے جذبات کار فرما ہیں۔ ہلکا سا ذوقِ تصوف بھی اثر انداز ہوا ہے اس موضوع کے بعض خطرناک مراحل کا خاص طور پر جائزہ لینے پر یہ اطمینان ہوا کہ مؤلف خوب بچ کر نکلے ہیں۔ حیرت ہے کہ مؤلف نے ایک طرف تو خدا کے حضور پوری کائنات کے عبادت گذار ہونے کا وسیع تصور قرآن سے اخذ کیا، لیکن دوسری طرف دنیائے انسانیت کے لیے وہ عبادت کا انفرادی نظریہ لے کر بیٹھ گئے۔ چنانچہ کتاب اس سے بحث نہیں کرتی کہ اجتماعی و تمدنی زندگی اور ایک اسٹیٹ اور ایک سوسائٹی کی تشکیل میں عبادت کے اثرات کیا ہیں۔ تاہم کتاب پڑھی جانے کے قابل ہے۔

اسبابِ تقسیمِ ہند | از جناب وصی احمد صاحب۔ ملنے کا پتہ: ۲/۲ نظام منزل ۲ے، ایم، I، کراچی قیمت: مجلد تین روپے آٹھ آنے۔

یہ مسلمانانِ ہند کی سیاسی حرکت کی، اور بالخصوص تحریکِ پاکستان کی تاریخ ہے۔ اس موضوع پر جب تک کوئی اعلیٰ پایہ کی کتاب میدان میں نہ آجائے، وصی احمد صاحب کی اس کوشش کو بسا غنیمت سمجھنا چاہیے۔

تشریح الافکار | از جناب سیفی صاحب۔ ملنے کا پتہ: ایم عبدالحمید اینڈ کمپنی۔ اردو بازار۔ لاہور۔ قیمت مجلد تین روپے۔

اس کتاب کی نوعیت ... کے سمجھنے میں خاصی کاوش سے کام لینا پڑا ہے۔ پوری کتاب دیکھ جانے سے بالآخر یہ اندازہ ہوا کہ مؤلف نے تاریخ انسانیت کو سامنے رکھ کر اس میں اسلام ... ... کا مقام واضح کرنا چاہا ہے۔ یوں کہئے کہ مذہب و الحاد کی کشمکش پر ایک تبصرہ ہے۔ اس سلسلے میں کتاب کا دوسرا باب جو فکرِ ابراہیمی کے عنوان سے ہے خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ اگر چھٹے باب کو شامل کر لیا جائے جو دعوتِ محمدی پر مشتمل ہے تو مؤلف کا تصورِ اسلام سامنے آجاتا ہے۔ مگر بایں ہمہ کچھ پلے نہیں پڑتا۔ اس کی وجہ معلوم کرنے کے لیے بھی بہت سوچنا پڑا۔ سوچنا کیا پڑا، کتاب اور صاحب کتاب کا "تجزیۂ نفس" کرنا پڑا۔ درحقیقت وہ ایسے اسباب

ہیں کہ جن کے زیرِ اثر نہ تو کتاب ایک پرزور دعوتی انداز کی حامل بن سکی ہے اور نہ ایک منظم فکر کی آئینہ دار۔ پہلا سبب یہ کہ مؤلف مذہبی پہلو سے پرپیچ در پیچ ذہنی مراحل سے گذرے ہیں، اور دوسرا یہ کہ جس حق کو موصوف حق مانتے ہیں اس کو "فضا کے تنگ و ترش" اور "وقت کے نازک" ہونے کی وجہ سے کھل کر کہہ نہیں سکے۔ آپ کی رائے میں "نازک باتوں کا ابھی وقت نہیں"۔ اس لیے جو کچھ دل میں ہے اور جو کچھ آنکھوں سے دیکھا ہے سارا بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ان نازک باتوں کے کہنے کا وقت وہ ہوگا جبکہ "امریکہ و انگلینڈ کی طرح یہاں بھی ہائڈ پارک بن جائیں گے" ہماری رائے میں اس اخلاقی کمزوری کے ساتھ دوسروں کی رہنمائی اور بصیرت افروزی کے لیے قلم اٹھانا ایسا اوقات اور زیادہ الجھنیں پیدا کر دینے کا موجب ہوتا ہے۔

یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہ آسکی کہ ایک طرف تو بابوں کے باب پوری تاریخ عالم پر تبصرہ کرنے میں گزرتے ہیں، لیکن آخر میں جاکر بجائے اس کے کہ اس تبصرہ سے اصولی نتائج اخذ کیے جاتے اور اسلام کے عالمگیر اور غیر متغیر حقائق سامنے لائے جاتے، کتاب ہندوستان کی جدوجہدِ آزادی اور مسلمانوں کی تحریکِ پاکستان کی طرف ایک غیر متوقع موڑ مڑ جاتی ہے۔ اس مرحلے میں بھی ایک قاری یہ امید کرتا ہے کہ شاید اب پاکستان کے آئندہ نظامِ حیات کی بات چھیڑنا مقصود ہے اور پچھلے سارے ابواب کا زورِ استدلال اسی آخری مبحث کی پشت پناہی کرنے کے لیے استعمال ہونے والا ہے، مگر افسوس کہ ایسا بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ اس موقع پر یکایک "نمونۂ محشر" کے عنوان سے دسواں باب مسلمانوں پر ہندوؤں کے مظالم کا تذکرہ لیے ابھر آتا ہے۔ یہ باب بڑا دردناک اور عبرتناک سہی لیکن یہ باب بھی کسی مقصد تک قاری کو پہنچائے بغیر ختم ہوجاتا ہے۔ اب کتاب ایک اور کروٹ لیتی ہے اور علم و عقل میں مکالمہ شروع ہوجاتا ہے اور اس کے بعد ایک مباحثہ سامنے آتا ہے۔ مگر افسوس کہ ان چیزوں کا کوئی مقصدی تعلق کتاب کے ابتدائی لمبے لمبے ابواب سے نہیں ہے۔

علاوہ بریں مختلف مواقع پر بعض خیالات خاص طور پر کھٹکتے ہیں، مگر ان کی تفصیل یہاں عرض نہیں کی جاسکتی۔

کتابت و طباعت کے غیر معیاری ہونے کا ماتم خود مؤلف نے بھی کیا ہے اور اس میں وہ بیچارے صریحاً مظلوم نظر آتے ہیں۔

(بقیہ اشارات)

سمیٹ دیا ہے، آپ اسے پھیلیئے نہیں" اور "کیا آپ کو یاد نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو دین میں افراط برتنے سے روکا ہے"؟ اور یہ کہ "آپ رسول اللہ کو کیا جواب دیتیں اگر وہ آپ کو اس طرح کسی صحرا میں ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ کی طرف اونٹ دوڑاتے ہوئے دیکھ لیتے"؟

پھر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے اس قول کو یاد کیجیے کہ "عائشہ کے لیے ان کا گھر اُن کے ہودے سے بہتر ہے"

اور حضرت ابوبکرہؓ کا یہ قول بخاری میں ملاحظہ فرمایئے کہ میں جنگِ جمل کے فتنے میں مبتلا ہونے سے صرف اس لیے بچ گیا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد یاد آگیا کہ "وہ قوم کبھی فلاح نہیں پاسکتی جس نے اپنے معاملات ایک عورت کے سپرد کردیے ہوں"۔

حضرتِ علیؓ سے بڑھ کر اُس زمانے میں کون شریعت کا جاننے والا تھا؟ انہوں نے صاف الفاظ میں حضرت عائشہ کو لکھا کہ آپ کا یہ اقدام حدودِ شریعت سے متجاوز ہے، اور حضرت عائشہؓ اپنی کمال درجے کی ذہانت و فقاہت کے باوجود اس کے جواب میں کوئی دلیل نہ پیش کرسکیں۔ حضرت علیؓ کے الفاظ یہ تھے کہ "بلاشبہ آپ اللہ اور اس کے رسول ہی کی خاطر غضبناک ہو کر نکلی ہیں، مگر آپ ایک ایسے کام کے پیچھے پڑی ہیں جس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ڈالی گئی۔ عورتوں کو آخر جنگ اور اصلاح بین الناس سے کیا تعلق؟ آپ عثمان کے خون کا دعویٰ لیکر اٹھی ہیں، مگر میں سچ کہتا ہوں کہ جس شخص نے آپ کو اس بلا میں ڈالا اور اس معصیت پر آمادہ کیا وہ آپ کے حق میں عثمان کے قاتلوں سے زیادہ گناہ گار ہے"۔

دیکھیے، اس خط میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ کے فعل کو صریحاً خلافِ شرع قرار دے رہے ہیں۔ مگر حضرت عائشہ اس کا کوئی جواب اس کے سوا نہ دے سکیں کہ جل الامر عن العتاب۔ معاملہ اب اس حد سے گزر چکا ہے کہ عتاب و ملامت سے کام چل سکے"۔

پھر جنگ جمل کے خاتمے پر جب حضرت علیؑ ام المومنینؓ سے ملنے تشریف لے گئے تو انہوں نے کہا:
یَا صَاحِبَةَ الْهَوْدَجِ قَدْ اَمَرَكِ اللّٰهُ اَنْ تَقْعُدِیْ فِیْ بَیْتِكِ ثُمَّ خَرَجْتِ تُقَاتِلِیْنَ؟ "ہودے والی، اللہ نے آپ کو گھر بیٹھنے کا حکم دیا تھا اور آپ لڑنے کیلئے نکل پڑیں" مگر اس وقت بھی حضرت عائشہ یہ نہ کہہ سکیں کہ اللہ نے ہم عورتوں کو گھر بیٹھنے کا حکم نہیں دیا ہے اور ہمیں سیاست اور جنگ میں حصہ لینے کا حق ہے۔

ان سب سے بڑھ کر یہ کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کو اس فتنے پر متنبہ کر دیا تھا۔ ابن قُتَیبَہ کی روایت ہے کہ بصرے کے راستے میں جب حضرت عائشہ حَوْأَب کے مقام پر پہنچیں تو کتے بھونکتے ہوئے ان کے ہودے کی طرف لپکے۔ حضرت عائشہ نے چونک کر پوچھا یہ کونسا مقام ہے۔ محمد بن طلحہ نے عرض کیا حَوْأَب۔ حضرت عائشہ نے فرمایا: "اب میں آگے نہیں جا سکتی مجھے یہیں سے پلٹنا ہے۔" پوچھا "کیوں"؟ فرمایا "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی بیویوں سے یہ کہتے سنا ہے کہ تم میں سے کسی پر حَوْأَب کے کتے بھونک رہے ہیں، اور پھر آپ نے مجھ سے خطاب کر کے فرمایا کہ "خبردار! اے حُمیراء کہیں وہ تم ہی نہ ہو۔" آخر کار حضرت عائشہ کو قسم کھا کر یقین دلایا گیا کہ یہ مقام حَوْأَب نہیں ہے۔ تب وہ آگے چلنے پر راضی ہوئیں۔ ابن قُتیبہ کہتا ہے کہ یہ پہلی جھوٹی شہادت تھی جو اسلام میں دی گئی۔

پھر یہ بھی ثابت ہے کہ آخر کار حضرت عائشہؓ خود اپنے اس فعل پر پچھتاتی رہیں۔ چنانچہ علامہ ابن عبدالبر استیعاب میں یہ روایت لائے ہیں کہ ام المومنینؓ نے عبداللہ ابن عمرؓ سے شکایتہً فرمایا "اے ابو عبدالرحمٰن تم نے کیوں نہ مجھے اس کام پر جانے سے منع کیا"؟ انہوں نے جواب دیا: "میں نے دیکھا کہ ایک شخص (یعنی عبداللہ بن زبیر) آپ کی رائے پر حاوی ہو گیا ہے اور مجھے امید نہ تھی کہ آپ اس کے خلاف چل سکیں گی۔" اس پر ام المومنینؓ نے فرمایا "کاش تم مجھے منع کر دیتے تو میں نہ نکلتی۔"
اس کے بعد جناب صدیقہؓ کے عمل میں آخر کیا دلیل باقی رہ جاتی ہے جس کے بل بوتے پر کوئی

صاحب علم یہ دعویٰ کر سکتا ہو کہ اسلام میں عورتیں بھی سیاست اور نظمِ مملکت کی ذمہ داری میں شریک قرار دی گئی ہیں؟ رہے وہ لوگ جن کے لیے اصل معیارِ حق صرف دنیا کی غالب قوموں کا طرزِ عمل ہے اور جنہیں بہر حال چلنا اُسی طرف ہے جس طرف انبوہ جا رہا ہو، تو انہیں کس نے کہا ہے کہ اسلام کو اپنے ساتھ ضرور لے چلیں؟ ان کا جدھر جی چاہے شوق سے جائیں، مگر کم از کم اتنی راستبازی تو ان میں ہونی چاہیے کہ جس مقصد کے دراصل وہ پیرو ہیں اُسی کا نام لیں، بلا دلیل اسلام کی طرف وہ باتیں منسوب نہ کریں جن سے خدا کی کتاب، اور اس کے رسول کی سنت، اور قرونِ مشہود لہا بالخیر کی تاریخ صاف صاف انکار کر رہی ہے۔

ایک اور اعتراض ہم پر اُس تجویز کے سلسلے میں کیا گیا ہے، جو قادیانیوں کو ایک اقلیت قرار دے کر اُن کے لیے بلحاظِ تعداد نشستیں مخصوص کرنے کے بارے میں ہم نے پیش کی ہے۔ اس پر متعدد حضرات نے ہم کو یہ لکھا ہے، کہ آپ کی اس تجویز کے معنی یہ ہیں کہ آپ مجالسِ قانون ساز میں غیر مسلموں کو نمائندگی دینے کا اصول تسلیم کر رہے ہیں، حالانکہ اب تک آپ یہ کہتے رہے ہیں کہ ایک اسلامی ریاست کے نظم کی ذمہ داری سنبھالنا صرف اُن لوگوں کا کام ہے جو اس ریاست کے بنیادی اصولوں کو تسلیم کرتے ہوں، رہے دوسرے لوگ تو وہ اس ذمہ داری میں شریک نہیں کیے جا سکتے، البتہ ان کو تہذیبی خود اختیاری دی جا سکتی ہے، جس کا نقشہ آپ نے خود اپنے دستوری خاکے میں دیا ہے۔ اب کونسی ایسی نئی حقیقت آپ پر منکشف ہوئی ہے جس کی بنا پر آپ نے اپنی سابق پوزیشن کو تبدیل کر لیا ہے۔

اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اصولاً ہم اب بھی اسی بات کے قائل ہیں کہ ایک اسلامی ریاست کے نظم کو چلانا صرف اُن لوگوں کی ذمہ داری ہے جو اسلام کے اصولوں پر ایمان رکھتے ہوں اور غیر مسلموں کا اس ذمہ داری میں شریک ہونا نہ صرف شرعاً بلکہ عقلاً بھی صحیح نہیں ہے، لیکن پاکستان کے مخصوص حالات پر اس اصول کو منطبق کرنے میں ہم اس مسئلے کے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہاں کی غیر مسلم اقلیتیں مفتوح نہیں ہیں کہ ہم ایک فاتح کی حیثیت سے اپنے اصول ان پر مسلط کر سکیں۔ یہ مملکت تلوار

کے زور سے قائم نہیں ہوئی ہے، بلکہ سابق برطانوی حکومت ملک کو اس طرح تقسیم کر کے گئی ہے کہ کچھ غیر مسلم آبادیاں آپ سے آپ اس جغرافی علاقے میں آگئی ہیں جس میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے۔ اس طریقے سے بنی ہوئی مملکت میں جو نظام قائم کیا جائے اس میں فاتحانہ رویہ اختیار کرنا نہ تو مناسب ہے اور نہ مبنی بر انصاف۔ اس کے برعکس ہمارے نزدیک زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو غیر مسلموں کو راضی اور مطمئن کر کے اس نظام میں شامل کیا جائے جو ہم اکثریت ہونے کی حیثیت سے یہاں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آغاز کار میں ہم اپنا مذکورہ بالا اصول حرف بحرف نافذ کریں گے تو غیر مسلموں کو، جو اب تک ایک اصولی حکومت کے تصور سے نا آشنا اور مشترک سیاسی نظام کے نظریے سے مانوس رہے ہیں، یہ محسوس ہوگا کہ ہم ان کو حکومت میں نمائندگی سے محروم کر کے ایک ظلم کر رہے ہیں اور یہ چیز ان کے اندر مملکت اسلامی کے لیے وہ جذبۂ وفاداری پیدا نہ ہونے دے گی جو ایک ذمی گروہ میں ہونی چاہیے۔ اس لیے سردست ایک عارضی بندوبست کی حیثیت سے ہم اس کو جائز اور مناسب سمجھتے ہیں کہ ان کو ملک کی پارلیمنٹ میں نمائندگی دی جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ جب وہ ایک اصولی حکومت کے تصوّر سے اچھی طرح مانوس ہو جائیں گے اور عملاً اُن کو اس کا تجربہ ہو جائے گا تو وہ خود اس بات کو تسلیم کریں گے کہ اس طرز کی حکومت کے نظم کو چلانے کی ذمہ داری میں ان لوگوں کا شریک ہونا صحیح نہیں ہے جو اس کے بنیادی اصولوں کو نہ مانتے ہوں۔ اس طرح تھوڑے صبر سے کام لے کر ہم وہ چیز ان سے برضا و رغبت منوا سکیں گے، جسے آج سخت ناراضامندی کے بغیر ان پر مسلط نہیں کیا جا سکتا۔

بسا اوقات اس طرح کی تجاویز کو دیکھ کر آدمی کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ اپنے مانے ہوئے اور بار بار کے بیان کیے ہوئے اصولوں سے صریح انحراف ہے اور یہاں تک بھی ایک شخص کہہ گزرتا ہے کہ جب یہ تمہارے اپنے قول کی رُو سے ایک شرعی اصول ہے تو تم کس طرح اس کی خلاف ورزی کرنے کی جسارت کرتے ہو۔ لیکن دراصل شریعت ہی کے اصولوں میں سے ایک اصول اور بھی ہے جسے لوگ بالعموم ایسے مواقع پر نظر انداز کر جاتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ احکام کی تنفیذ میں اُن حالات کو ملحوظ رکھا

جائے جن میں کوئی حکم نافذ کیا جانا ہو اور اگر حالات کسی حکم کی تنفیذ کے لیے سازگار نہ ہوں تو آنکھیں بند کر کے حکم نافذ نہ کر دیا جائے بلکہ اس کی تنفیذ سے پہلے حالات کو سازگار کرنے کی کوشش کی جائے۔ شراب کی بندش، سود کی تحریم، قوانینِ فوجداری کی تنفیذ، زکوٰۃ کی تحصیل اور دوسرے بہت سے شرعی احکام کے نافذ کرنے میں اللہ اور اس کے رسول نے اس حکمت کو پوری طرح ملحوظ رکھا تھا اور کسی حکم کو بھی اس وقت تک نافذ نہ کیا تھا جب تک اس کے لیے زمین تیار نہ کر لی گئی ہو۔ اس قاعدے کو نگاہ میں رکھ کر جب ہم اپنے ملک کے حالات کو دیکھتے ہیں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں ایک مدتِ دراز سے نیم اسلامی یا غیر اسلامی نظام قائم ہوتے رہے ہیں اور ایک خالص اسلامی نظامِ زندگی سے طبائع پوری طرح مانوس نہیں ہیں، بلکہ اس کے اصولوں کا فہم بھی لوگوں کے لیے دشوار ہو گیا ہے۔ ایسے حالات میں اگر کوئی چاہے کہ اسلامی نظام کو بتمام و کمال یک لخت نافذ کر دے تو وہ حکمتِ تدریج کے خلاف کام کرے گا اور ہو سکتا ہے کہ اس کی یہ کوشش بجائے خود اسلامی نظام کے قیام و نفاذ کی راہ میں حارج ہو جائے۔ حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ جس اصول کے نفاذ میں ہم حالات کی ناسازگاریوں کو سدِ راہ پائیں، اس کو کچھ دیر کے لیے ملتوی کر کے مناسب حالات پیدا کرنے کی کوشش کریں اور جب مناسب حالات پیدا ہو جائیں تب اس کو نافذ کریں۔ اس طرح کا التوا اصول سے انکار یا انحراف نہیں ہے اور نہ اس پر خلاف ورزی کا اطلاق ہوتا ہے۔
